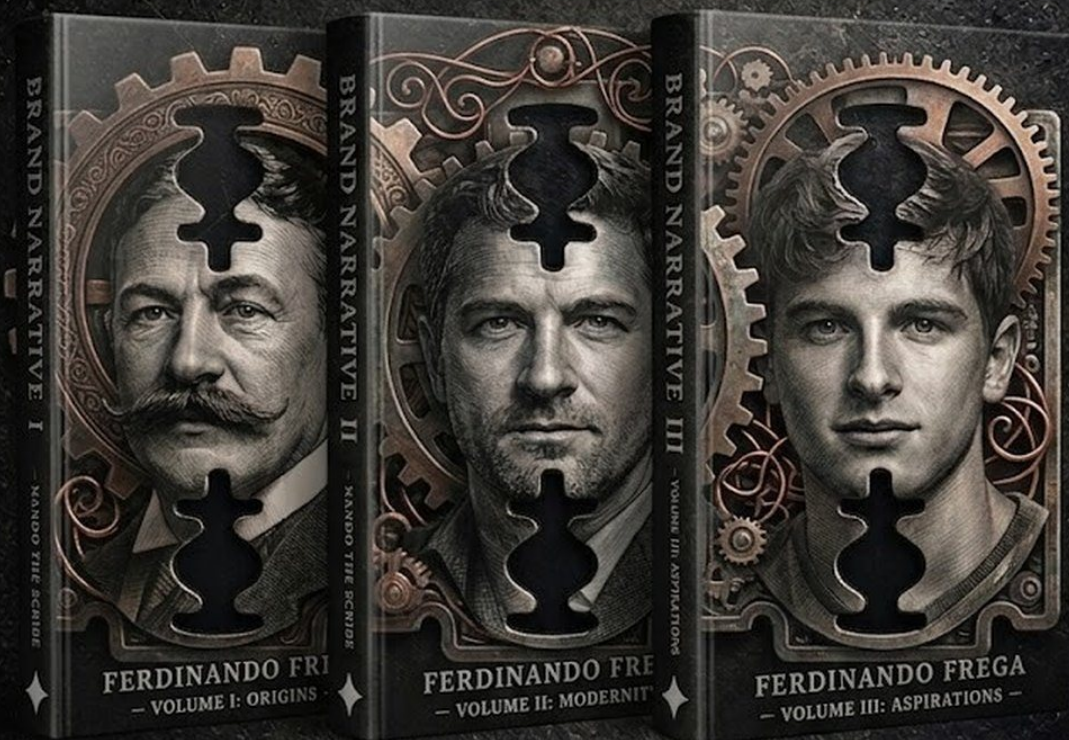


BRAND NARRATIVE GILLETTE.



FERDINANDO FREGA

— NANDO THE SCRIBE — フレガ・サン — Ferdinando —



Brand Narrative Gillette

THE SYSTEM · 08

Roots & Memory سلسلے کی دوسری جلد: چونتیس مختصر تحریریں جو Gillette کو ایک کمپنی کے طور پر نہیں بلکہ ایک طریقے کے طور پر پڑھتی ہیں — وہ نظم و ضبط، وہ ٹائمنگ اور وہ جیلٹ جو اُس نے اپنے اندر سے گزرنے والے آدمیوں میں چھوڑی، اور جنہیں خاندان، سیلز کے میدانوں، ہوائی اڈوں اور کام کاجی زندگی کے معمولی حادثوں کے ذریعے بیان کیا گیا ہے۔

ترقیمہ

فرڈینڈو فریگا — نینڈو کاتب — پانچواں بلیڈ

ضابطہ روپے کے بیانیاتی پیش رو۔ اُنہوں نے ایک ہی خیال کے گرد ایک ڈالر کا ادارتی ایکو سسٹم کھڑا کیا: فنانس کو پیسے کا مسئلہ درپیش نہیں۔ اسے روپے کا مسئلہ درپیش ہے۔

ONEDOLLAR-STORIES ایکو سسٹم کے اندر مرتب اور منظم کی گئی۔
ڈیجیٹل ڈھانچہ: NAPLES-POST · NOASPECTTIME · ONEDOLLAR-STORIES
پہلی بار 2026 میں شائع ہوئی۔ ڈیجیٹل مطالعے کے لیے موزوں
ایک صاف، جدید ٹائپوگرافک ترتیب میں کمپوز کی گئی۔ ریاستہائے متحدہ
میں شائع ہوئی۔

حق اشاعت کا اعلان

© 2026 فرڈینڈو فریگا۔ جملہ حقوق محفوظ ہیں۔ اس اشاعت کا کوئی حصہ مصنف کی پیشگی تحریری اجازت کے بغیر کسی بھی شکل میں یا کسی بھی ذریعے سے، بشمول فوٹو کاپی، ریکارڈنگ یا دیگر برقی یا میکانیکی طریقوں کے، نقل، تقسیم یا منتقل نہیں کیا جا سکتا، سوائے تنقیدی جائزوں میں شامل مختصر اقتباسات اور بعض دیگر غیر تجارتی استعمالات

کے جن کی حق اشاعت کا قانون اجازت دیتا ہے۔ اس تصنیف کا غیر مجاز استعمال، نقل یا تقسیم ممنوع ہے۔

بیان

برانڈ کا بیانیہ Gillette کی کہانی نہیں سناتا۔ وہ اُس کی کہانی سناتا ہے جو Gillette کے آدمی کرتے ہیں۔ یہی فرق ہے۔ یہی اشتہار اور شناخت کے درمیان، مارکیٹنگ اور سچ کے درمیان دراڑ کی لکیر ہے۔ برانڈ ایک پروڈکٹ ہے۔ اُس برانڈ کے ہاتھوں ڈھلا ہوا آدمی ایک نظام ہے۔ Gillette نے بلیڈ بنائے۔ آدمیوں نے اُن سے زندگیاں بنائیں۔ اور وہ زندگیاں — نظم و ضبط، جیلٹ، باریکی، ناکامیاں، فتوحات، ٹائمنگ، زخموں کے نشان — ہی اصل بیانیہ ہیں۔ یہ جلد Gillette کی وضاحت نہیں کرتی۔ یہ اُس انسانی ڈھانچے کو بے نقاب کرتی ہے جو اُس کی دیواروں کے اندر ڈھالا گیا اور اُن سے بہت دور تک لے جایا گیا۔ یہاں کی ہر کہانی کمپنی کے بارے میں نہیں ہے۔ وہ اُس آدمی کے بارے میں ہے جسے کمپنی نے پیدا کیا — جس طرح وہ سوچتا ہے، جس طرح وہ چلتا ہے، جس طرح وہ دنیا کو پڑھتا ہے، جس طرح وہ اُس کے سوا کچھ اور ہونے سے انکار کرتا ہے جو وہ بن گیا۔ Gillette فریم ہے۔ آدمی مواد ہیں۔ اور میں اُن میں سے ایک ہوں۔ یہی بیانیہ ہے۔ برانڈ نہیں۔ برانڈ کا نتیجہ۔

نینڈو

ابتدائیہ

یہ کسی سہ جلدی سلسلے کی دوسری کتاب نہیں۔ یہ برانڈ کے بیانیے کے ایک نظام کی دوسری تہ ہے۔ Gillette نے ایک صدی پروڈکٹ بنانے میں صرف کی۔ میں وہ حصہ بنا رہا ہوں جو اُن کے پاس کبھی نہیں تھا: بیانیے کا ڈھانچہ — وہ جسے کوئی کارپوریشن اپنی ہی دیواروں کے اندر سے پیدا نہیں کر سکتی۔ پہلی جلد داخلے کا دروازہ تھی: اس بات کا ثبوت کہ ایک مصنف اجازت کے بغیر کسی برانڈ کی تاریخ میں قدم رکھ سکتا ہے۔ دوسری جلد تصدیق ہے: وہ لمحہ جب برانڈ ایک صنعتی شے نہیں رہتا اور ایک بیانیاتی وجود بن جاتا ہے — یاد، نظم و ضبط، جیومیٹری اور شناخت کا ایک نظام۔ میں Gillette کی کہانی نہیں سنا رہا۔ میں دکھا رہا ہوں کہ

Gillette میرے اندر کیسے موجود ہے: طریقے کے طور پر، جبلت کے طور پر، ڈھانچے کے طور پر، دنیا کو پڑھنے کے ایک انداز کے طور پر۔ یہ جلد اُس چیز کی نمائندگی کرتی ہے جس کے بارے میں برانڈ ابھی نہیں جانتے کہ اُنہیں اس کی ضرورت ہے: ایک ایسا بیانیہ جو اُنہیں اپنے اندر سموئے، اُن سے پہلے آئے اور اُن کے بعد بھی زندہ رہے۔ کتاب نہیں۔ ایک پوزیشننگ۔ ناسٹیلجیا نہیں۔ ایک نقشہ تعمیر۔ یادداشت نہیں۔ ایک پیٹنٹ۔ یہ دوسری جلد ہے۔ برانڈ کا بیانیہ جاری ہے۔

نینڈو

نظام

اس دنیا میں ہمیشہ سے ایک ایسی منڈی رہی ہے جو کبھی نہیں گرتی۔ نہ کوئی مالیاتی بحران، نہ کوئی کساد بازاری، نہ کھپت میں کوئی کمی۔ بس انسانی زندگیوں کی فطری آمد و رفت۔ یہ ایک کالا بازار ہے، ہاں — مگر تیل کا نہیں۔ اُس کے لیے تو پہلے ہی کافی لڑائیاں ہو رہی ہیں۔ میں کالے جادو کی بات کر رہا ہوں۔ جادوگر، ڈاننیں، اور وہ سب جو ہر اُس راستے سے لوگ بھرتی کرتے ہیں جو اُنہیں مل جائے — ایسے لوگ جو تقدیر کو اپنا کام کرنے دینے کے بجائے روحانی چالوں سے کسی دوسرے کی زندگی بدلنا چاہتے ہیں۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ بائبل کے ایک مقام پر خود یسوع بھی ایک بد نیت منتر کا نشانہ بنے تھے۔ اور سب جانتے ہیں کہ اُس کے بعد کیا ہوا۔ یہ سب افریقہ سے شروع ہوتا ہے، پھر ہندوستان کے ایک مخصوص علاقے میں بنجاروں جیسی خانہ بدوش قوموں تک پھیل جاتا ہے۔ دو ہزار سال سے زیادہ عرصے سے یہ بڑھتا اور پھیلتا رہا ہے، اُن کے ہاتھوں استعمال ہوتا ہوا جو سمجھتے ہیں کہ وہ زندگیاں اور تقدیریں بدل سکتے ہیں، اس یقین کے ساتھ کہ شیطان اور بل زبوں اب بھی اُس واحد اقتدار کو للکار سکتے ہیں جو قائم ہے: خدا۔ مگر تقدیریں کوئی نہیں بدلتا۔ کیونکہ اصل کہانی تقدیریں ہی بناتی ہیں۔ اور اگر تمہارے منہ سے کوئی خواب، کوئی تخیل، کوئی بے قابو پیش آگهی، کوئی غیر ارادی اشارہ نکل جائے — کوئی ایسی چیز جو سانچوں، زمروں، منطق میں نہ سمائے — تو یہ ہوتا ہے: 1. تم اب قابل اعتبار نہیں رہتے۔ 2. تم پر بیمار کا لیل لگا کر تمہیں معائنے کے لیے بھیج دیا جاتا ہے۔ 3. نفسیاتی معالج تمہیں گولیوں سے بھر دیتا ہے: وہی واحد ہے جو دوہرا کماتا ہے۔ 4. تم اکیلے رہ جاتے ہو، اپنے فطری مدار سے باہر۔ 5. سب سے

بڑی رکاوٹ وہی لوگ بن جاتے ہیں جو تمہارے سب سے قریب ہیں۔ 6. تمہیں بولنے کی اجازت نہیں رہتی۔ جب کوئی نظام جنم لیتا ہے تو یہی ہوتا ہے۔ اٹھارہ برس میں نے شیونگ سسٹم بیچے، ایک ایک کر کے خصوصیات، طریقہ کار، تکنیک، جدت، فوائد سمجھاتے ہوئے، اور پھر برانڈ، وہ مہر جو ضمانت دیتی تھی کہ وہ ناکام نہیں ہو سکتا۔ کچھ کچھ ویسا ہی جیسا آج میرے ساتھ ہو رہا ہے۔ مگر میں اس سے زیادہ نہیں کہہ سکتا، ورنہ سیدھا اوپر والے چھ نکات میں جا گروں گا۔ تم سے، پڑھنے والو، میں بس اتنا مانگتا ہوں: یہ کہانی اور یہ تاریخ اپنے ذہن میں بٹھا لو۔ ایک دن میں تمہیں بتاؤں گا کہ اس کا انجام کیا ہوا۔

نینڈو

سیلزمین

جب میں نے 1985 میں The Gillette Company کے اندر یہ نوکری شروع کی، تو دنیا ویسے ہی چلتی تھی جیسے دستی کتابچے دکھاوا کرتے تھے کہ وہ چلتی ہے۔ پھر جون 1996 آیا، اور انہوں نے مجھے پانچ روزہ تربیتی کورس پر بھیج دیا۔ مقرر ماریو سلوانو تھا — سابق مینیجر، سابق سی ای او، سابق پروفیسر، سابق کنسلٹنٹ، سابق سب کچھ۔ ایک ایسا آدمی جس کے پاس جوہر سے زیادہ عہدے تھے۔ کورس کا نام تھا تجارتی مذاکرہ کار۔ پانچ دن کا تھیٹر: کچھ پیشہ ور، کچھ اداکار، کچھ شعبہ باز۔ اُس نے ایک آخری جملے پر تماشا ختم کیا: "اس دنیا میں کوئی چیز ایسی نہیں جو بیچی نہ جا سکے۔" میں وہ جملہ پچیس برس اٹھائے پھرا۔ اُس پر یقین کیا۔ اُس کا دفاع کیا۔ اُسے استعمال کیا۔ 2021 تک، جب میں نے یہ کھیل شروع کیا — لکھنا — اور آخرکار سچ سمجھ میں آیا: یہ سب سے بڑی بکواس تھی جو میں نے کبھی خریدی تھی۔ وہ قائل کر دینے والا تھا، ہاں۔ قابل اعتبار، نہیں۔ اُسے بس ایک تصحیح کی ضرورت تھی: "چیز" کی جگہ "پروڈکٹ" رکھ دیتا۔ تب جملہ ٹھیک بیٹھ جاتا۔ کیونکہ پروڈکٹ بیچی جا سکتی ہے۔ چیز کا معاملہ اور ہے۔ سیلزمین ہمیشہ وہ آدمی ہوتا ہے جو یوں لگتا ہے جیسے تمہیں کچھ دے رہا ہو، جبکہ اُسی مسکراہٹ کے ساتھ وہ کچھ اور لے جا رہا ہوتا ہے۔ تاریخ کے پہلے حقیقی سیلزمین — اور واحد جن کا میں احترام کرتا ہوں — یسوع تھے۔ انہوں نے کلام بیچا۔ اور یہ کام انہوں نے اب تک بننے والے پہلے مارکیٹنگ ڈیپارٹمنٹ کے ساتھ کیا: گلیل کے بارہ مچھیرے۔ اُن میں سے کوئی بھی ایم

آئی ٹی سے نہیں۔ مگر نظم و ضبط والے۔ کامل نہیں — بس اتنے کہ کافی ہوں۔ باقی؟ وہ اپنے سیلز کورس چلاتے اور مال بٹورتے رہیں۔ انسان گیلی مٹی ہیں۔ کوئی نہ کوئی ہمیشہ ڈھالے جانے کی قیمت چکائے گا۔

نینڈو

بال

بال ایک ایسی تفصیل ہیں جسے سمجھنے کا لوگ دکھاوا کرتے ہیں۔ وہ انہیں صفائی، جمالیات، شناخت، ثقافت، رسم کہتے ہیں۔ مگر بال ان میں سے کچھ بھی نہیں۔ وہ ایک سرحد ہیں: اُس کے درمیان جو تم دکھاتے ہو اور اُس کے جو تم چھپاتے ہو۔ کچھ لوگ حجاموں پر بھروسا کرتے ہیں، کچھ بیوٹیشنوں پر، کچھ اُن جدید مشینوں پر جو خود مختاری اور کمال کا وعدہ کرتی ہیں۔ مگر بال وہیں رہتے ہیں، ضدی، ایک حیاتیاتی یاد دہانی: تم شہری بننے سے بہت پہلے ایک جانور تھے۔ اور وہ دشمن نہیں ہیں۔ وہ ایک بے آرام دوست ہیں، اصل کے گواہ۔ وہ جسم پر پھیلتے ہیں، وہ رنگ اٹھاتے پھرتے ہیں جو تمہارے جینیاتی نقشے نے مقرر کیا، اور ایک ایسی کہانی سنبھالے رکھتے ہیں جسے تم مٹا نہیں سکتے۔ گنج پن والے بھی اُن سے خالی نہیں — اُنہوں نے بس اُنہیں ایک ایسے عرصے کے لیے کھو دیا ہے جسے کوئی ناپ نہیں سکتا۔ بالوں کو سمجھنے کے لیے تمہیں آغاز کی طرف لوٹنا ہوگا — قدیم انسان کی طرف، اُس جگہ کی طرف جہاں تمہارے سارے بیانیے لوٹتے ہیں۔ میں اسے ماقبل تاریخ کے ایک نوآر کی طرح دیکھتا ہوں۔ گھاس کی ایک دیوار کے پیچھے دو بیولے، باتیں کرتے ہوئے۔ ایک تیسرا آتا ہے اور پہچان نہیں پاتا کہ مرد کون ہے اور عورت کون۔ چہرہ کافی نہیں۔ چہرہ جھوٹ بولتا ہے۔ تو عورت اپنی شناخت دوبارہ لکھنے کا فیصلہ کرتی ہے۔ وہ دریا تک جاتی ہے، پانی میں اپنا عکس دیکھتی ہے، اور ایک داڑھی دیکھتی ہے۔ وہ اُس کی نہیں ہے۔ وہ اُس کی پہچان متعین نہیں کرتی۔ وہ اُسے ممتاز نہیں کرتی۔ اُسے ایک نوکیلا پتھر ملتا ہے اور وہ بال اتارنے لگتی ہے، ایک ایک کر کے۔ اُسے پتا چلتا ہے کہ بال دوبارہ آہستہ اُگتے ہیں — ایک چھوٹا سا فائدہ: یہ رسم روز کی قربانی نہیں مانگتی۔ اور اُسے اس سے بھی بڑی بات پتا چلتی ہے: مرد اُسے مختلف نظر سے دیکھتا ہے۔ فرق کشش بن جاتا ہے۔ فرق زبان بن جاتا ہے۔ اُس لمحے سے بالوں کی ثقافت شروع ہوتی ہے: پہلے علامتی، پھر سماجی، پھر صحت و صفائی کی، پھر سائنسی، پھر نظریاتی۔ یہاں تک کہ جدید انتہائیں آ

پہنچتی ہیں — وہ جو کہتے ہیں کہ بال حفاظت کرتے ہیں اور اُنہیں رہنا چاہیے، وہ جو کہتے ہیں کہ قبول کیے جانے کے لیے اُنہیں غائب ہو جانا چاہیے، وہ جو اُنہیں تراش خراش کر سنوارتے ہیں تاکہ چاہے جائیں۔ مگر سچ سادہ ہے: بال پیدا ہوتا ہے، بڑھتا ہے، خم کھاتا ہے... اور خم پر آ کر مر جاتا ہے۔ جڑ زندہ رہتی ہے، ضدی، اُن بعض خیالوں کی طرح جنہیں تم قوت ارادی سے بھی نہیں نکال سکتے۔ اور ایک آخری اصول ہے — وہ جو صرف داستان گو جانتا ہے: کبھی بال کو بیل نہ بننے دینا۔ فرق بس ایک حرفِ علت کا ہے۔ مگر وہ سب کچھ بدل دیتا ہے۔

نینڈو

براہ راست آڈیشن — رسائی

انگریزی نسخہ

جو تم پڑھنے والے ہو وہ نہ کوئی کتاب ہے، نہ کوئی مجموعہ، نہ کوئی ادارتی منصوبہ۔ یہ خود کو بے پردہ کرنے کا ایک عمل ہے۔ ایک براہ راست آڈیشن۔ میرا۔ 61 برس کی عمر میں مجھے ایک سادہ سی بات سمجھ آئی: لوگ میرا کوئی ایک روپ نہیں چاہتے۔ وہ وہ سب کچھ چاہتے ہیں جو میں ہوں — بغیر زمرے کے، بغیر کردار کے، بغیر لیبل کے۔ تو چلو یہی کرتے ہیں۔ چلو میز پر وہ رکھ دیتے ہیں جو باقی سب کچھ ہٹا دینے کے بعد بچتا ہے — آواز، یاد، زخم، شفافیت، ہنسی، تھکن، سچ۔ یہ دس کہانیاں کسی کو قائل کرنے کے لیے نہیں ہیں۔ یہ دکھانے کے لیے موجود ہیں۔ مجھے۔ تمہیں۔ اُنہیں جو یہاں نہیں ہیں۔ اُنہیں جنہوں نے کبھی واقعی نظر نہیں ڈالی۔ یہ تعارف ہے۔ باقی سب اسٹیج پر ہیں۔ انگریزی۔ جاپانی۔ ہندی۔ ہونے کے تین طریقے۔ خود کو بے پردہ کرنے کے تین طریقے۔ ایک آڈیشن کے اندر کھڑے ہونے کے تین طریقے۔ پڑھنے کا لطف اٹھاؤ۔

نینڈو

پیش لفظ

ہم جو ہیں، وہ اُن لوگوں کی وجہ سے بھی ہیں جن سے ہم ملتے ہیں۔ ہم اُن کے سب کچھ کے مقروض ہیں، اُس وقت بھی جب ہم یہ تسلیم نہیں کرتے۔

انسان فطرتاً ناشکرا ہے: وہ لیتا ہے، بھول جاتا ہے، چیزوں کا عادی ہو جاتا ہے۔ اور یہ ناشکری ہزار صورتوں میں ظاہر ہوتی ہے، تقریباً ہمیشہ بغیر کسی شور کے۔ یہ عمودی خیال اُس سے آتا ہے جو میں بنتا جا رہا ہوں۔ میں اسے ہر روز محسوس کرتا ہوں: کچھ اسے تحفہ کہتے ہیں، کچھ ایک ایسا دماغ جو کبھی بند نہیں ہوتا، کچھ اسے ایک مرض کہتے ہیں۔ دوسرے اسے کچھ بھی نہیں کہتے، کیونکہ وہ اسے محسوس نہیں کرتے۔ جب وہ پوچھتے ہیں ”آپ کیا کام کرتے ہیں؟“، تو ہمیں وہ جواب دینا چاہیے جس کا ہم نے بچپن میں، بے فکری کے برسوں میں، خواب دیکھا تھا۔ کوئی نہ ہنستا۔ وہ ہمیں ایک صاف مسکراہٹ دیتے — وہ جو اُن بچوں کو دی جاتی ہے جو ابھی امکانات پر یقین رکھتے ہیں۔ پھر ایک صبح میں جاگتا ہوں اور پتا چلتا ہے کہ مجھے پیسہ سنبھالنا آتا ہے۔ مگر ہمیشہ ایک مگر ہوتا ہے۔ میرے پاس پیسہ نہیں ہے۔ اور مجھے ٹالنا پڑتا ہے۔ میرا آڈیشن اب شروع ہوتا ہے۔ ان دس کہانیوں کے ساتھ۔ اُن کے لیے جو انہیں پڑھیں گے، دوبارہ پڑھیں گے، یا نظر انداز کر دیں گے۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یہ یہیں رہیں گی۔ ہمیشہ کے لیے، کم از کم یہ۔

نینڈو

دفتری اوقات کے بعد کی میٹنگ

مرنا میری توقع سے زیادہ جلدی ہوا۔ نہ کوئی چمکتی سرنگ۔ نہ کوئی رشتہ دار میری طرف دوڑتا ہوا۔ نہ کوئی جذباتی ساؤنڈ ٹریک۔ بس خاموشی۔ ایک بہت نفیس خاموشی۔ تقریباً کارپوریٹ۔ میں نے سوچا آخر کار میں آرام کر سکوں گا۔ چالیس برس کی بے کار میٹنگوں، بین الاقوامی کانفرنس کالوں، دو دو گھنٹے بول کر بھی کچھ نہ کہنے والے ڈائریکٹروں، اور PowerPoint کو مذہب سمجھنے والے مینیجروں کے بعد... میں نے سوچا یہ سب ختم ہو گیا۔ مہلک غلطی۔ مرنے کے کوئی بیس منٹ بعد مجھے ایک نوٹیفکیشن ملا۔ نہ کوئی فرشتہ۔ نہ کوئی بدروح۔ بے عیب لباس میں ایک عورت نے مجھے ایک سیاہ فولڈر تھمایا۔ ”مسٹر فریگا، 11 بجے ابدی میٹنگ روم میں آپ کا انتظار ہے۔“ ”کس لیے؟“ ”جائزہ۔“ ”کس چیز کا؟“ ”آپ کی زندگی کا۔“ ”کیا کال پر کر لیں؟“ ”نہیں۔“ میں کمرے میں داخل ہوا۔ ایک مضحکہ خیز حد تک لمبی میز۔ ہر طرف لوگ بیٹھے تھے۔ سب مُردہ۔ مگر روئے میں بہت زندہ۔ میں نے بدترین قسم کو فوراً پہچان لیا: سابق مینیجر۔ برسوں سے مرے ہوئے

مگر اب بھی حکم چلانا نہ چھوڑ پانے والے۔ ایک چارٹوں کے ذریعے بات کر رہا تھا۔ دوسرے نے ایک پریزنٹیشن تیار کر رکھی تھی۔ ایک اور بار بار دہرائے جا رہا تھا: "آئیے اصل نکتے کی طرف واپس چلتے ہیں۔" اصل نکتہ کبھی نہیں آیا۔ پھر میں نے تاریخی شخصیات دیکھیں۔ نپولین، بے چین۔ جولیس سیزر، اُکتایا ہوا۔ ایک فرعون، سوتا ہوا۔ دو پوپ کسی ایسی بات پر جھگڑتے ہوئے جو کسی کو یاد نہیں تھی۔ McKinsey کا ایک کنسلٹنٹ جو 2087 میں مرا تھا اور اب بھی بے معنی انگریزی الفاظ استعمال کر رہا تھا: "الائنمنٹ۔" "پرفارمنس۔" "اسکیل ایبلٹی۔" مر کر بھی ناقابل برداشت۔ اُنہوں نے مجھے بٹھایا۔ ایک بوڑھے آدمی نے فائل کھولی۔ "مسٹر فریگا۔" "حاضر۔" "ہم نے آپ کی زندگی کا تجزیہ کیا ہے۔" "میری طرف سے تعزیت۔" کوئی نہیں ہنسا۔ مُردے۔ مزاح کی حس انتہائی خراب۔ اُنہوں نے شروع کیا: "آپ نے اتنا زیادہ کیوں لکھا؟" "کیوں نہیں؟" "آپ نے ہزاروں کی تعداد میں مفت مواد کیوں تخلیق کیا؟" "یہ دیکھنے کے لیے کہ کون سمجھتا ہے۔" "آپ نے باقی سب کی طرح بیچا کیوں نہیں؟" "کیونکہ باقی سب افسردہ دکھائی دیتے تھے۔" خاموشی۔ اُنہوں نے نوٹس لیے۔ پھر اصل سوال آیا۔ "کیا آپ کو موت سے ڈر لگتا ہے؟" "نہیں۔" "کیوں؟" "کیونکہ آپ لوگوں کا انتظام زندوں سے بھی بُرا ہے۔" پہلی بار کوئی مسکرایا۔ چیئرمین نے فائل بند کر دی۔ "ہم نے فیصلہ کر لیا ہے۔" "جنت؟" "نہیں۔" "جہنم؟" "نہیں۔" "تو پھر کیا؟" اُس نے مجھے گھور کر دیکھا۔ "ہم آپ کو سب سے مشکل شعبے میں تعینات کر رہے ہیں۔" "کون سا؟" اُس نے مجھے ایک بیج تھمایا۔ میں نے اسے آہستہ آہستہ پڑھا:

حال ہی میں بنے ارب پتیوں سے ملاقاتیں

میں فوراً سمجھ گیا کہ موت بس ایک بُری طرح انجام دی گئی ترقی تھی۔ اور سب سے بُری بات: جو پہلا شخص مجھ سے ملنا چاہتا تھا، وہ پہلے ہی دروازے کے باہر بیٹھا تھا۔ ایلون مسک۔ وہ مسکرا رہا تھا۔ میں نہیں۔

نینڈو

وقت: ایک کتاب

کون سی کلاسیکی کتاب ہے جو تمہارے خیال میں ضرورت سے زیادہ
سراپی گئی ہے؟

میں کبھی صحیح معنوں میں پڑھنے والا نہیں رہا۔ ثقافت زندگی کے سفر
میں خود ہی میرے پاس آئی، اور میں نے دن بہ دن اُس کے اثرات چکھے۔ میرا
پہلا مطالعہ کامکس تھے — TEX WILLER، میرا افسانوی ہیرو — پھر کبھی
کبھار DIABOLIK، اور آخر کار JACULA، فحش کارٹون۔ جن کہانیوں نے مجھے
سب سے زیادہ متاثر اور مسحور کیا، وہ وہ تھیں جو مجھے اتفاقاً ملیں،
جیسے تقدیر طنز کر رہی ہو: یہ چیز فریگا کو دے دیتے ہیں، وہ سدھر جائے
گا۔ انٹرنیٹ کی طرف میرا رخ ضرورت سے نہیں، ارادے سے شروع ہوا، اور
مجھے یاد ہے کہ وہ فوراً پڑھنے کی ایک ضرورت بن گیا — مگر کتابوں کی
نہیں۔ میں کبھی قصباتی ذہن کا آدمی نہیں رہا۔ میں بڑی خبروں کی تلاش
میں نہیں تھا، شور مچانے والی، سنسنی خیز خبروں کی۔ وہ تفصیلات جو
غیر اہم لگتی ہیں — اکثر وہی اصل سچائیاں چھپائے ہوتی ہیں۔ یہ بائبل
تھی، ایک تحفہ جو مجھے شادی سے پہلے ملا، جس نے میرے افق کھولے اور
میری نظر کو بہتر کیا، جو افقی سے عمودی ہو گئی — کم از کم آج میرا
یہی خیال ہے۔ اور اس کے بعد وہ باطنی مکتب جس میں مجھے 33 برس
کی عمر میں بھیجا گیا، اور وہ سب کچھ جو جیومیٹری کے اندر فن تعمیر
ہے، اور علم اعداد بطور اثر، نہ کہ سبب۔ صرف اسی نے مجھے ایک دو
قدری منطق پختہ کرنے دی — انسانوں کی طرف اعشاری اور الگورتھم اور
اے آئی کی طرف ثنائی — اہم سوال پوچھنے اور موزوں جواب پانے کا واحد
طریقہ، ہم آہنگ، نہ کہ ڈھالے ہوئے۔ پڑھنا کوئی ایسی مشق نہیں جو صرف
کسی کہانی کے اندر ادا ہوتی ہو۔ اصل جہت چیزوں کو، حالات کو پڑھنا ہے،
اور مفروضے باندھے بغیر سمجھنا۔ یہی میری بہترین کتاب ہے۔

نینڈو

(ایک تفصیل جو زیادہ تر لوگ نہیں جانتے)

Gillette 1950 کی دہائی میں اٹلی آئی۔ بہت کم لوگوں کو یاد ہے کہ اُس کی اصل اطالوی ریڑھ کی پڈی کھڑی کرنے میں کس نے مدد دی۔ اُس کی تاریخ کے دو اہم ترین رہنما، دونوں پُولیا کے تھے۔ رافائیلے دی تولیو۔ اُنہوں نے سیلز سے آغاز کیا۔ پھر انسپکٹر بنے۔ ایریا مینیجر۔ اسسٹنٹ سیلز ڈائریکٹر اٹلی۔ آخرکار، بیلجیم میں مینیجنگ ڈائریکٹر۔ اور پھر تھے پیٹرو کیومو۔ وہ مارکیٹنگ اور اشتہارات کے راستے آئے۔ آخرکار وہ Gillette اٹلی کے مینیجنگ ڈائریکٹر بنے اور 1970 کی دہائی سے 2000 کی دہائی تک ایک مرکزی شخصیت رہے۔ جنوبی اٹلی کے دو آدمی۔ ایک امریکی کارپوریشن کے اندر۔ اس سے بہت پہلے کہ ترغیبی تقریریں ایک صنعت بن جائیں۔ اُنہوں نے ذاتی برانڈ نہیں بنائے۔ اُنہوں نے نتائج بنائے۔ اور مجھ جیسے لوگوں کے لیے جو بعد میں نیچے سے داخل ہوئے... وہ اس بات کا ثبوت تھے کہ نظم و ضبط حسب نسب سے کہیں آگے لے جا سکتا ہے۔ اُن برسوں میں تم Gillette میں ڈگریوں، خاندانی رشتوں یا زنانہ خوبیوں کی بدولت داخل نہیں ہوتے تھے۔ تم صرف ایک وجہ سے داخل ہوتے تھے: قابلیت۔ پھر آتی تھی لگن، نظم و ضبط، ذہانت، ترتیب، اور قواعد کا احترام۔ باقی سب کچھ تم سُرک پر سیکھتے تھے۔ میں نے آٹھ برس کی اسکولی تعلیم سے زیادہ کچھ لیے بغیر آغاز کیا — قانون کی مقرر کردہ کم سے کم حد۔ میرے پاس جو تھا وہ تھی ٹائمنگ، جہلت، اور نیچے سے شروع کرنے کی عاجزی۔ ہر شام تم اپنی رپورٹیں جاری کرتے ہو۔ ہر صبح تم ایریا مینیجر کو اعداد بھیجتے ہو۔ اور ہفتے کے آخر میں تم خلاصہ مکمل کرتے، سب کچھ ساتھ نتھی کرتے، اور یقینی بناتے کہ لفافہ پیر کی صبح سے پہلے چھوڑ دیا گیا ہو۔ اخراجات، وصولیاں، فروخت، مارکیٹ کے نوٹس، علاقے کا تجزیہ، حریفوں کا رویہ — میدان کے لیے Gillette کا ایک طرح کا پی ایم۔ اور پھر آتا تھا عملی حصہ۔ آرڈر بند کر لینا کافی نہیں تھا۔ تم ہر گاہک کا کھاتہ ہاتھ سے اپ ڈیٹ کرتے تھے: تاریخ، مقدار، ایک ایک آئٹم۔ کوئی سافٹ ویئر نہیں۔ کوئی شارٹ کٹ نہیں۔ بس تم، ایک قلم، اور سچ۔ ہر روز آخرکار تمہاری بات فون پر فیروچیو لوراسکی سے ہو ہی جاتی ہے — کریڈٹ کنٹرول۔ گاہک کا ایک سینٹ بھی کم ہوتا تو وہ آرڈر روک دیتے تھے۔ سیلز والے اس سے نفرت کرتے تھے، مگر مہینے کے آخر میں ہر کوئی کوئی نہ

کوئی راستہ نکال لیتا تھا۔ تم مہینہ، سہ ماہی اور بین الاقوامی سہ ماہی بند کرنے کے لیے پیپے کی تہہ تک کھرچ ڈالتے تھے۔ لوگ سمجھتے تھے کہ تمہیں ڈگری چاہیے۔ اصل میں جو چاہیے تھے وہ تھے لوہے کے ٹٹے — اُن مشکلوں سے بچ نکلنے کے لیے جنہیں بلیڈ بھی نہ کاٹ سکتے تھے۔ ایسا ہی تھا۔ ایک لمبی تعلیم کا خلاصہ۔ اور غرور نے مجھے اور آگے دھکیلا: میں نے اکاؤنٹنگ کا ڈپلوما اپنے بل بوتے پر حاصل کیا۔ جہاں تک یونیورسٹی کا تعلق ہے، میں وہاں گیا — مگر پڑھنے نہیں۔ میں وہاں عورتوں کو رجھانے جاتا تھا۔ میرے وجود کی اصل وجہ۔

نینڈو

کوئی ایسا جس کی تمہیں توقع نہیں

21 فروری 1993 کو میں نے اپنے ہونے والے سسرال والوں کو بتایا کہ میں جلد ہی اُن کی بیٹی سے شادی کرنے والا ہوں — میکیلے کی بہن، میری موجودہ اور واحد قانونی بیوی۔ چند گھنٹے پہلے میں اپنا ”محبت کا پارسل“ پہنچا چکا تھا: اپنے جڑواں بیٹے۔ وہ ہنسی اور بولی کہ میں پاگل ہوں۔ میکیلے فوراً نہ سمجھ سکا کہ کیا ہو رہا ہے۔ ایلیزابتا تیس برس کی تھی۔ سب کا خیال تھا کہ یہ بہت جلدی ہے۔ ایسا فیصلہ منطق، منصوبہ بندی اور خاندانی مشاورت کا حق دار تھا۔ وہ اُن مثالی Barilla-Mulino-Bianco خاندانوں میں سے ایک لگتے تھے — بس فرق یہ تھا کہ پہلے میری وجہ سے گھوم رہا تھا، اور میں نے کبھی اجازت نہیں مانگی۔ اگلی صبح، چوبیس گھنٹوں کے اندر، وہ صدمہ پوری طرح ہضم کر چکا تھا۔ وہ سخت چہرے کے ساتھ، غصے میں، میری طرف آیا اور بولا: ”تم یہاں آ دھمکتے ہو، میرے خاندان کو الٹ پلٹ کر دیتے ہو، ہمیں ایک حقیقت سے آگاہ کرتے ہو، نہ کوئی خبر، نہ کوئی اطلاع — اور پھر چلے جاتے ہو، جیسے سپر مارکیٹ سے ڈبل روٹی خرید رہے ہو۔“ وہ میں تھا۔ وہ غلط نہیں تھا۔ میں اٹھائیس برس کا تھا۔ میں اُس کی طرف دیکھ کر مسکرایا اور کہا: ”لگتا ہے تم نے نفسیات پڑھی ہے۔ تجزیے میں اچھے ہو۔ مگر تم سے نفسیاتی طب کا بنیادی حصہ رہ گیا ہے — وہ جو پڑھا نہیں جا سکتا۔ اُسے صرف جیا جا سکتا ہے۔“ پھر میں چلا گیا۔ دو مہینوں میں، اکیلے، میں نے پوری شادی کا انتظام کیا۔ اسی سال 23 اپریل کو میری شادی ہو گئی۔ اور 17 اکتوبر کو میرے بیٹے پیدا ہوئے، جڑواں لڑکے۔ کوئی ایسا جس کی تمہیں توقع نہیں۔

ایک نوکری: میری

آج میں وہ سب لکھ رہا ہوں جو میں چاہتا تھا کہ آپ سے روبرو کہوں۔ واقعات کو تازہ کرنا ہی واحد ادبی راستہ رہ گیا ہے۔ اور کچھ نہیں۔ مئی 1985 تھا جب میں نے آپ کی نوکری کی پیشکش قبول کی۔ اور پھر بھی، آپ آجر نہیں تھے۔ آپ بس میرے والد تھے۔ میں نے سب سے نچلے درجے سے آغاز کیا، اور مجھے کوئی تکلیف نہ ہوئی۔ میں مسکرایا۔ اور دانت بھیچے بغیر آگے بڑھتا رہا۔ دادا پہلے ہی بات صاف کر چکے تھے۔ کانوں میں چالیس برس گزارنے کے بعد ایک دن انہوں نے کہا تھا: ”ترقی کبھی سینٹی میٹروں یا پیسوں میں نہیں ناپی جاتی۔ صرف حقائق میں۔“ اور انہوں نے صرف تیسری جماعت تک پڑھا تھا۔ ہر ملاقات جس نے ہمیں ایک دوسرے کو دیکھنے کا موقع دیا، اُس نے وہ چیز پیدا کی جسے میں آج آپ کی تصدیق کرتا ہوں: پیشہ ورانہ، منطقی، عقلی — اور بالکل آخر میں جا کر، جذباتی۔ ہمارے ڈی این اے میں کبھی دشمن نہیں تھے۔ صرف ایسے لوگ تھے جنہیں ہم نے راستہ دینے سے انکار کیا۔ میری ماں نے مجھ پر حملہ کرنے کا کوئی موقع کبھی ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ وہ کہا کرتی تھیں کہ مجھے عمر بھر کی نوکری تھال میں رکھ کر دی گئی ہے اور مجھے ہمیشہ اپنے والد کا شکر گزار رہنا چاہیے۔ ورنہ کون جانے میں کیا کرتا۔ کون جانے میری زندگی کا کیا بنتا۔ تو میں نے فیصلہ کیا کہ میری پیشہ ورانہ زندگی کا انجام بدلنا ہوگا۔ اور دسمبر 2003 میں میں نے پیسہ، وقار، طاقت اور رتبہ چھوڑ دیا — صرف انہیں یہ دکھانے کے لیے کہ میں کون ہوں۔ مگر وہ کبھی نہ سمجھیں۔ مجھے اپنی اصل جہت تلاش کرنے میں تئیس برس لگے۔ اب آپ دونوں میں سے کوئی میرے پاس نہیں۔ مگر میں اب بھی آپ دونوں کے قریب ہوں۔ اور ایک دن میں آپ تک پہنچ جاؤں گا۔ اور جبکہ میرے والد ہمیشہ ٹھیک ٹھیک جانتے تھے کہ میں کون ہوں — میری خوبیاں کیا تھیں، اور کیا نہیں تھیں — میری ماں اُن سے بات کرتے ہوئے کہا کرتی تھیں: ”شاید پیدائش کے وقت اسے بدل دیا گیا تھا۔ کیونکہ یہ آدمی کوئی ایسا بن گیا جس کی کسی کو توقع نہ تھی۔ اور کسی طرح... کہتے ہیں یہ، میرا بیٹا ہے۔“

مثالی زندگی

اگر مجھے اپنی مثالی زندگی بیان کرنی ہو تو میں کہوں گا کہ وہ موجود ہی نہیں۔ بلکہ یوں کہوں: وہ صرف اُن لوگوں کے تصور میں موجود ہے جو اب بھی یقین رکھتے ہیں کہ زندگی کوئی ایسی چیز ہے جسے ڈیزائن کیا جا سکتا ہے، نہ کہ ایسی چیز جس میں سے بس گزرا جاتا ہے۔ آج WordPress کا مقیم نفسیاتی معالج ہماری طرف وہی روز کا سوال اچھالتا ہے — ویسا سوال جو بچوں سے پوچھا جاتا ہے، جب وہ ابھی یہ سمجھتے ہیں کہ مستقبل ایک تحفہ ہے جسے اُن کے والدین پہلے ہی لپیٹ چکے ہیں۔ یہ بڑے ہی ہیں جو اپنے ادھورے خواب، اپنی خاموش ناکامیاں، اپنے دوبارہ استعمال شدہ سراب اپنے بچوں پر ڈالتے ہیں، اس امید میں کہ کوئی اور وہاں بہتر کر دکھائے گا جہاں اُنہوں نے کوشش تک نہ کی۔ زندگی کوئی سنجیدہ چیز نہیں۔ وہ کوئی ملکیت، کوئی جائیداد یا کوئی ذاتی اثاثہ نہیں۔ اور یہی وہ جگہ ہے جہاں انسانیت پھسلتی ہے: یہ سمجھ کر کہ وہ اُس چیز کی مالک بن سکتی ہے جس کا کبھی کوئی مالک ہونا ہی نہیں تھا۔ زندگی بس ایک نازک تحفہ ہے جس میں دو یقینی باتیں ہیں: وہ دن جب تم پیدا ہوتے ہو — جو تمہارے کاغذات پر چھپا ہوتا ہے — اور وہ دن جب تم مرتے ہو — جو اُن کاغذات پر چھپا ہوتا ہے جنہیں تم کبھی نہیں دیکھو گے۔ درمیان کی ہر چیز وہ ہے جو ہم ہیں، جو ہم چاہتے ہیں کہ ہوتے، جو ہمیں بدلتی ہے، اور جو آخر کار بن جاتی ہے۔ شعوری طور پر یا لاشعوری طور پر، کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ”مثالی زندگی“ سرکس کا ایک کرتب ہے، کسی جادوگر کا فریب نظر۔ ایک خیالی دنیا جو اُسی لمحے گھل جاتی ہے جب تم اُسے بہت قریب سے گھورتے ہو۔

نینڈو

ایک مینیجر کی زندگی

06:00 بجے جاگنے کی گھنٹی۔ تیس منٹ کی دوڑ، غسل، اخبار، ناشتہ۔
08:30 بجے وہ دفتر میں پہنچ چکا ہوتا ہے۔ سب سے پہلے آنا اور سب کے بعد جانا — دو اشارے جنہیں پوری کمپنی کسی وضاحت کے بغیر پڑھ لیتی ہے۔ 10:30 کافی کا وقفہ۔ 13:30 جلدی کا ہلکا کھانا۔ 18:30 وہ ذاتی کاموں یا دیر سے ہونے والی کسی کاروباری ملاقات کے لیے باہر نکلتا ہے۔ 20:00 بجے

وہ آخرکار گھر جاتا ہے، جہاں رات کا کھانا اُس کا منتظر ہوتا ہے۔ 21:30 بجے وہ اپنی میز پر بیٹھتا ہے — بائیں طرف لیپ ٹاپ، دائیں طرف ڈیسک ٹاپ — ڈیٹا کا تبادلہ کرتا ہے، اعداد کا جائزہ لیتا ہے، منصوبے بناتا ہے، تھکے ہوئے دماغ سے جدت بھرے خیالات نچوڑتا ہے۔ منافع مذہب ہے۔ باقی سب لوازمات ہیں۔ وہ رات ایک بجے بستر پر جاتا ہے۔ کوئی نہ کوئی ہمیشہ اُس کا بستر گرم کر رہا ہوتا ہے، اور وہ اپنے اندر کے مشینی حصے کو باگ ڈور سونپ دیتا ہے۔ 03:00 بجے آخرکار اُسے نیند آتی ہے۔ 06:00 بجے وہ پھر اٹھ جاتا ہے۔ تین گھنٹے کی نیند — اُن مشرقی تکنیکوں کے عین مطابق جو کم سے کم آرام میں بحالی کا وعدہ کرتی ہیں۔ ایک افسانہ جس پر وہ یقین رکھتا ہے کیونکہ یہ مشین کو چلتا رکھتا ہے۔ ہفتے اور اتوار کے دن مقدس ہیں۔ لذت، دل بہلاوے، خاندان۔ اُن دنوں وہ نہیں چاہتا کہ کوئی اُسے پریشان کرے — خاص طور پر ساتھی یا کمپنی کا کوئی بھی آدمی۔ سلطنت اپنے دروازے بند کر لیتی ہے۔ ایک مینیجر اچھا کماتا ہے، ہاں۔ مگر وہ ایسی ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھاتا ہے جو، اگر غلط سنبھالی جائیں، تو ناقابل تلافی نقصان اور تکلیف کا ایک لمبا سلسلہ پیدا کر سکتی ہیں۔ لوگ یہ بھول جاتے ہیں۔ اکثر یہ عہدہ کوٹ پر لگا کوئی بیج نہیں ہوتا۔ یہ ملازمین اور مالکان کی طرف سے ایک خاموش اعتراف ہوتا ہے — وہ لمحہ جب وہ تمہیں لاگت سمجھنا چھوڑ دیتے ہیں اور ایک وسیلہ سمجھنے لگتے ہیں۔ اور وہ اعتراف، جب آتا ہے، تو وہی واحد اصل تنخواہ ہے جو اُسے ملتی ہے۔

نینڈو

اصل استاد

...ٹھگی کے

ہم ساتھی تھے، میرے والد اور میں۔ ہم ایک ہی امریکی ملٹی نیشنل کے لیے کام کرتے تھے۔ سیلزمین۔ ادراکی ٹھگ۔ پہلا اصول ہمیشہ ایک ہی تھا: سب کے ساتھ انصاف اور اعتماد۔ دوسرا: گاہک کی اصل ضرورتوں کو گاہک سے پہلے سمجھ لینا۔ بیچنا پروڈکٹ دھکیلنا نہیں تھا۔ یہ کسی کو مصیبت سے بچنے میں مدد دینا تھا۔ زیادہ فروخت کا مطلب زیادہ پیسہ نہیں تھا۔ اس کا مطلب تھا گاہک کے لیے زیادہ اطمینان — جو مارکیٹ کا واحد اصل آقا ہے۔ ہم دونوں قومی سطح پر قیادت کے عہدوں پر رہ چکے تھے۔ مختلف

برسوں میں ہم دونوں معیار اور مقدار میں اٹلی میں پہلے نمبر پر پہنچے تھے۔ کبھی سرکاری نمبر ون نہیں۔ مگر میرا دل ہمیشہ ایک ہی تال پر دھڑکتا ہے: امریکہ۔ اور قدم امریکیوں ہی نے اٹھایا۔ اعلیٰ عہدیدار اپنی آنکھوں سے دیکھنے آئے کہ فریگا خاندان یہ کیسے کرتا ہے۔ 90 کی دہائی میں مسٹر ویکفیلڈ، سی ای او یورپ، میرے والد سے ملنے گئے۔ 2000 کی دہائی کے اوائل میں مسٹر ایلن بوتھ، عالمی نائب صدر، مشیروں اور سیلز ڈائریکٹروں کو ساتھ لیے مجھ سے ملنے آئے۔ کیا زندگی تھی ہماری۔ ہا ہا ہا۔ پھر میرے والد نے فیصلہ کیا کہ چالیس برس کافی ہیں۔ 1996 میں وہ ریٹائر ہو گئے۔ میں نے 2003 تک انتظار کیا۔ میں اڑتیس برس کا تھا، کمپنی میں اٹھارہ برس گزار چکا تھا۔ میں تھک چکا تھا۔ پیسہ کبھی ترجیح نہیں رہا تھا۔ صرف وہ چیزیں جو مجھے خوش رکھتی تھیں۔ میں یہ کہانی کیوں سنا رہا ہوں؟ کیونکہ آج، لکھاری بننے کے بعد، میری پوسٹیں بہت سے ملکوں میں پڑھی جاتی ہیں۔ آخر میں اصول آج بھی وہی ہے۔ آخر میں، اصول کبھی نہیں بدلا۔ بس تمہیں کہانی بیچنا آنا چاہیے۔

نینڈو

سنجیدہ آدمی

(وینچینزو فریگا)

میرے والد ریجیو کلابریا صوبے کے ایک قصبے، سیمینارا، میں تمباکو کی ایک چھوٹی سی دکان میں داخل ہوتے ہیں۔ وہ وہاں کے نہیں ہیں۔ وہ کام کے سلسلے میں اس علاقے میں ہیں، Gillette کے سیلز نمائندے۔ اندر اُن کا سامنا اپنے آبائی قصبے کے ایک پڑوسی سے ہو جاتا ہے، جو بینک میں کیشیئر ہے۔ وہ اُس سے پوچھتے ہیں، ”تم یہاں کیا کر رہے ہو؟“ وہ آدمی، پورے جوش میں، جواب دیتا ہے، ”گھوڑوں پر شرط لگا رہا ہوں۔“ میرے والد اُسے دیکھتے ہیں۔ ”اور ریس کورس کہاں ہے؟ میں دس برس سے یہاں رہ رہا ہوں اور کبھی کوئی نہیں دیکھا۔“ پڑوسی چالاک دکھنے کی کوشش میں طنزیہ مسکراتا ہے۔ وہ TOTIP کی شرط کی پرچی نکال کر اُنہیں دکھاتا ہے۔ میرے والد ایک لمحے کے لیے الجھ کر گھورتے ہیں، پھر ہنسی سے ہٹ پڑتے ہیں۔ وہ ایک ایسے آدمی سے بات کر رہے ہیں جو گھوڑوں پر شرط لگاتا ہے... گھوڑوں کے بغیر۔ وہ پہلے ہی سوچ رہے ہیں کہ میری ماں کو بتائیں گے، جو

اُس پڑوسی کو اچھی طرح جانتی ہیں — وہ برسوں سے اُن کا وفادار مداح ہے۔ وہ اندر ہی اندر ہنس رہے ہیں۔ ہنس اس لیے بھی رہے ہیں کہ اُنہیں کچھ اندازہ نہیں کہ کیا ہونے والا ہے۔ وہ دکان کے گاہکوں کے ساتھ کام کرتے رہتے ہیں، اُن کی پیٹھ دروازے کی طرف ہے۔ گاہک دروازے کی طرف سر سے عجیب اشارے کرتا رہتا ہے: ہاں/نہیں، ہاں/نہیں۔ میرے والد نہیں سمجھتے۔ اُن کے لیے یہ بس چھوٹے قصے کی اشارے بازی ہے۔ وہ کام ختم کرتے ہیں، خدا حافظ کہتے ہیں، اور اطمینان سے باہر نکل آتے ہیں۔ جیسے ہی وہ باہر قدم رکھتے ہیں، وہ اُنہیں روک لیتے ہیں۔ اُنہوں نے اُنہیں دبوچ لیا۔ وہ اُنہیں گرفتار کر لیتے ہیں۔ Carabinieri خوشی سے پھولے نہیں سما رہے: پندرہ برس بعد، اُنہیں یقین ہے کہ آخرکار وہ اُسے پکڑ چکے ہیں۔ اور میرے والد ہنستے ہیں۔ پاگلوں کی طرح ہنستے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ یہ مذاق ہے۔ تھانے میں وہ اُن سے کاغذات مانگتے ہیں، اُن کا پیشہ پوچھتے ہیں۔ وہ ہنستے ہنستے جواب دیتے ہیں۔ پھر سوال آتا ہے: ”تمہیں نہیں معلوم کہ تم یہاں کیوں ہو؟“ ”نہیں۔“ ”تم ہو بہو اُس آدمی جیسے دکھتے ہو جس کا ہم برسوں سے پیچھا کر رہے ہیں: ’سیمینارا کا مشین گن والا آدمی۔‘ آگے بڑھنے سے پہلے ہم میلان میں تمہاری کمپنی سے تصدیق کا انتظار کر رہے ہیں۔“ میرے والد ایک لمحے کو رکتے ہیں۔ ”اور آپ اُسے مشین گن والا آدمی کیوں کہتے ہیں؟“ ”کیونکہ مافیا کے جنازوں میں وہ رسم رکوا دیتا ہے، تابوت گھسیٹ کر سڑک پر لاتا ہے، اُسے کھولتا ہے، اور لاش میں پوری میگزین خالی کر دیتا ہے۔“ خاموشی۔ میرے والد اُنہیں دیکھتے ہیں۔ پھر کہتے ہیں: ”اچھا... تو میں ایک سنجیدہ آدمی ہوں۔“ وہ اُنہیں جانے دیتے ہیں۔ گاڑی میں چھوڑ آنے کی پیشکش کرتے ہیں۔ ”نہیں، شکریہ۔ میں پیدل جاؤں گا۔ میری اپنی گاڑی ہے۔“ کوئی معذرت نہیں۔ کوئی وضاحت نہیں۔ وہ ہنستے ہوئے گھر کی طرف چل پڑتے ہیں۔ دروازے پر رکتے ہیں۔ سوچتے ہیں کہ میری ماں کو کیا بتائیں۔ پھر فیصلہ کرتے ہیں: کچھ نہیں۔ اس لیے نہیں کہ اُنہیں ڈر ہے کہ وہ یقین نہیں کریں گی۔ بلکہ انکسار کی وجہ سے۔ اپنی ہی شبہ کے احترام میں۔ تاکہ اُنہیں کسی ایسے شخص کے ساتھ نہ ملا دیا جائے جو وہ نہیں ہیں۔ اُس قسم کا آدمی ہونا، جس کی کسی کو توقع نہیں۔

نینڈو

ہم جیسے تھے

مجھے ہمیشہ آغاز نے مسحور کیا ہے۔ وہ نہیں جو کتابوں میں لکھا ہے — وہ تو بس کسی کا اپنا بیان ہے، ایک نمائندگی، کبھی کوئی مطلق سچ نہیں۔ میری مراد اصل آغاز سے ہے، وہ جسے کوئی محفوظ نہ کر سکا۔ میں اُس کا تصور یوں کرتا ہوں۔ عورت — وہ پہلی حقیقی ہستی جس سے سب کچھ شروع ہوتا ہے — کسی غار کی تلاش میں جنگل سے گزرتی ہے۔ کچھ نہیں بدلا: آج بھی وہ ایک گھر ڈھونڈتی ہے، ایک ایسی جگہ جہاں خاندان بسائے، استحکام پیدا کرے، زندگی کو لنگر ڈالے۔ وہ سچ مچ ایک برتر ہستی ہے۔ اُس نے حیوانی دنیا سے سب کچھ جذب کیا: منطق، عقل، جذبہ، جبلت — سب ایک ناممکن وجدان سے جڑے ہوئے، سونگھنے کی ایک ایسی حس سے جو الوہیت کی سرحد کو چھوتی ہے۔ یہ ہے وہ۔ ہماری عورت۔ اُس کی حرکات بلیوں کی دنیا میں گونجتی ہیں: کبھی سخت نہیں، کبھی اچانک نہیں، ہمیشہ مخمل۔ اُس کی نگاہ اُس کی شناخت ظاہر کرتی ہے۔ اُس کے ذہن میں لامتناہی سوال ہیں — چھپن یکتا ضرورتیں، اُن میں سے کوئی بھی ترجیح نہیں، جیسے کہنا چاہتی ہو کہ مطلق پر ہمیشہ سوال اٹھانا چاہیے۔ پھر اُس نے نسل بڑھائی۔ جسم کی خاطر نہیں، تسلسل کی خاطر۔ اور اُس نے یہ ایک گوریلے کے ساتھ کیا — وہ ہمیشہ دستیاب میں سے بہترین چنتی ہے۔ وہ، اس دوران، ٹھیک وہیں رہا جہاں تھا۔ کھاتا، آرام کرتا، اپنی خلوت کی حاجت پوری کرتا۔ دو ضرورتیں، لاکھوں برس سے جوں کی توں۔ کچھ بھی ارتقا پذیر نہیں ہوا۔ یہ علم بشریات نہیں — میرے پاس نہ کوئی سند ہے، نہ کوئی تعلیمی تربیت، نہ کوئی طریقہ کار۔ یہ بس ایک ایسے آدمی کا تصور ہے جو آج صبح جاگا، باربرا اسٹرائسینڈ کو سنا، اور ایک سیدھی سی بات سوچی: ہم جیسے تھے۔

نینڈو

”ضرورت ذہن کو نکھارتی ہے؛ قلت قدر پیدا کرتی ہے — یہی وہ قدیم ترین قانون ہے جس کی ہم آج بھی اطاعت کرتے ہیں۔“

قید خانہ

قید خانہ — ایک ایسی جگہ جس سے ساری انسانیت ڈرتی ہے، وہ جگہ جس میں کوئی داخل نہیں ہونا چاہتا، پھر بھی جس سے آخرکار ہر کوئی گزرتا ہے۔ اپنی قدیم ترین صورتوں میں اسے محرومی کی سلطنت کے طور پر دکھایا جاتا تھا: آزادی کی، حرکت کی، عمل کی۔ پھر صدیوں کے دوران یہ ارتقا پاتا گیا اور دوسری چیزیں بن گیا۔ یہ لفظ ہی تمہیں فوراً سب سے واضح، سب سے حقیقت پسندانہ جگہ کی طرف گھسیٹ لے جاتا ہے: عدالتی جگہ۔ مگر یہ تو بس معاشرے کا سانچہ ہے، ایک ایسے لمحے کی درجہ بندی جو نہ صرف تمہاری زندگی بدل دیتا ہے بلکہ تمہاری سماجی حیثیت بھی بدل سکتا ہے۔ اسکول کی ایک یاد ذہن میں آتی ہے: سلویو پیلیکو، 1789-1854، جنہوں نے قید کے دوران Le Mie Prigioni لکھی — ایک دستی کتاب جو آج جذباتی سرائیں کاٹنے والے شوہر استعمال کرتے ہیں۔ ہاں، یہ کوئی عدالتی رسالہ نہیں، بلکہ انسان کے شناختی محور کے اندر ایک کیفیت ہے، کیونکہ ہم اپنے ہی اندر قید ہو سکتے ہیں۔ مگر اگر ایسا ہو جائے تو تمہیں نفسیاتی طب اور دواؤں کے علاج کا سہارا لینا پڑتا ہے، کیونکہ خیالات کے اندر ذہن کا علاج تمام طبی ادب کی واحد حقیقی حد ہے۔ ذہنی قید وہ کوٹھڑی ہے جسے کوئی ڈاکٹر پوری طرح نہیں کھول سکتا۔ مجھے یاد ہے جب رودیکا نام کی ایک رومانیائی عورت نے ایک رات مجھے اپنے گھر میں بند کر دیا تھا۔ شراب کی چار بوتلیں پینے کے بعد وہ پاگلوں کی طرح ہنس رہی تھی، اور مجھے تھوڑی دیر بعد اٹلی واپسی کے لیے جہاز پکڑنا تھا۔ مجھے مذاکرات کرنے پڑے اور میز پر کلابریا کنونشن رکھنا پڑا — ظاہر ہے میری اپنی ایجاد — جس کے مطابق پرائی سرزمین پر مہمان کو ہمیشہ ایک موقع دینا چاہیے۔ یہ کافی تھا کہ دروازے کھل جائیں اور میں باہر نکل آؤں۔ جذباتی، رومانوی، قلبی قید خانے میں لوہے کی سلاخیں نہیں ہوتیں۔ اُس میں صرف یادیں ہوتی ہیں — وہ جنہیں تم کبھی نہیں بھولتے۔

نینڈو

میں کامیابی کے لیے تیار نہیں تھا

فرڈیننڈو نے برسوں کامیابی کا تصور کرتے گزارے تھے۔ تربیت، محنت، زور — پورا دستور العمل۔ مگر جب کامیابی آخرکار آئی، تو اُس نے دستک نہیں

دی۔ اُس نے لات مار کر دروازہ کھولا، اندر آئی، اور پوچھا: ”تو؟ تیار ہو؟“ وہ تیار نہیں تھا۔ سب کچھ تیزی سے ہوا۔ ایک منصوبہ جو اُس نے ضدی لگن سے کھڑا کیا تھا، اچانک پہچانا جانے لگا۔ میڈیا کی کالیں، کانفرنسوں کے دعوت نامے، اشتراکات — ہر کوئی اُس کا ایک ٹکڑا چاہتا تھا۔ شروع میں اُسے بہت اچھا لگا۔ پھر اُسے احساس ہوا کہ کامیابی ایک ایسے دستور العمل کے ساتھ آتی ہے جو اُسے کبھی ملا ہی نہیں تھا۔ توقعات بڑھیں۔ شکوک بھی۔ ہر فیصلہ ایک بم لگتا جسے ناکارہ بنانا ہو۔ ہر غلطی ایک ممکنہ تعزیتی اعلان دکھائی دیتی۔ اس دوران اُس کا نظام الاوقات پھٹ پڑا: میٹنگیں، ڈیڈ لائنیں، انٹرویو۔ اُس کا جذبہ — وہ چیز جس نے سب کچھ شروع کیا تھا — ”اہم چیزوں“ کے بوجھ تلے گھٹنے لگا۔ تو اُس نے واحد منطقی کام کیا: وہ بھاگ گیا۔ ہمیشہ کے لیے نہیں — بس اتنی دیر کے لیے کہ سانس لے سکے۔ خاموشی میں اُس نے خود سے وہ سوال پوچھا جو کوئی نہیں پوچھتا جب سب ٹھیک چل رہا ہو: ”میں دراصل کر کیا رہا ہوں؟“ اور جواب سادہ تھا: اُس نے کامیابی اور شور کو گڈمڈ کر دیا تھا۔ وہ ایک مختلف انداز کے ساتھ لوٹا۔ اُس نے نہ کہنا سیکھا۔ اُس نے کام دوسروں کو سونپنا سیکھا۔ اُس نے سیکھا کہ ہر جگہ ہونے کا مطلب کہیں نہ ہونا ہے۔ اور آہستہ آہستہ جذبہ لوٹ آیا — آتش بازی کی طرح نہیں، بلکہ ایک ننھی سی لو کی طرح جو بجھتی نہیں۔ پیچھے مڑ کر دیکھا تو اُس نے سچ سمجھ لیا: کوئی بھی کبھی کامیابی کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ کامیابی اُس مہمان کی طرح ہے جو جلدی آ جاتا ہے، بہت زیادہ کھاتا ہے، اور فرنیچر پر تنقید کرتا ہے۔ مگر اگر تم پہلی آمد جھیل جاؤ، تو اُس کی میزبانی کرنا سیکھ جاتے ہو۔ اور یہی — تالیاں نہیں — اصل جیت ہے۔

نینڈو

500 گرام

جون 1996 تھا۔ کمپنی کے بوسٹن والے ہیڈکوارٹر میں ایک نئی پروڈکٹ کے عالمی اجرا کے لیے ایک عالمی سیلز میٹنگ رکھی گئی ہے۔ اطالوی ڈویژن نے سیلز ٹیم کو دو الگ الگ پروازوں میں بانٹنے کا فیصلہ کیا — ایک روم سے روانہ ہونے والی، دوسری میلان سے۔ منزل ایک ہی: پہلے نیویارک، پھر بوسٹن۔ وجہ سادہ تھی۔ اگر کچھ گڑبڑ ہو جاتی تو وہ نہیں چاہتے تھے کہ پوری اطالوی سیلز فورس ایک ہی جہاز میں ہو۔ کارپوریٹ منطق۔

مریضانہ، مگر منطقی۔ اُس شام ہم بخیریت پہنچ گئے۔ اگلی صبح میں نے خود کو اطالوی اعلیٰ انتظامیہ کے چھ ارکان میں گھرا پایا۔ اُن میں سے کوئی انگریزی نہیں بولتا تھا۔ وہ بھوکے تھے۔ اور کسی طرح انہیں کھانا کھلانے کی ذمہ داری مجھ پر آن پڑی۔ اُنہوں نے مجھ سے پوچھا کہ ہمیں کہاں جانا چاہیے۔ آسان۔ ”بوسٹن ہاربر،“ میں نے کہا۔ ”ہم لابسٹر پاستا کھا رہے ہیں۔“ اُنہوں نے مجھے ایسے دیکھا جیسے میں باتیں گھڑ رہا ہوں۔ ٹیکسی ڈرائیور تک محظوظ ہوا۔ اُس نے مجھے اپنا ذاتی نمبر دیا اور پوچھا کہ میں بوسٹن میں کہاں رہتا ہوں۔ پھر اُس نے سمجھایا کہ اگر میں اُس کی ٹیکسی سروس استعمال کرتا رہوں تو وہ مجھے کمیشن دے گا۔ یہ امریکہ میں میرا پہلا اصل سبق تھا۔ ہر چیز کا ایک نظام تھا۔ آمد و رفت کا بھی۔ ہم ریستوران پہنچے۔ مالکان سسلی کے دو بھائی تھے جو چالیس برس پہلے امریکہ آ بسے تھے۔ اُنہوں نے ہمارا گھر والوں کی طرح استقبال کیا۔ سب نے لابسٹر لنگوئنی منگوائی۔ میں نے کچھ ذرا مختلف منگوایا۔ پانچ سو گرام لنگوئنی۔ دو لابسٹروں کے ساتھ۔ پلیٹیں آئیں۔ سب خوش دکھائی دے رہے تھے۔ میں نے اپنی پلیٹ دیکھی اور فوراً مالک کو بلایا۔ ”یہ پانچ سو گرام نہیں ہے۔“ وہ مکمل خاموشی میں مجھے گھورتا رہا۔ میں اٹھا۔ ریستوران سے نکلا۔ پیدل قریب کی ایک دکان تک گیا۔ پاستا خریدا۔ واپس آیا۔ اُس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ ”سب کچھ پھینک دیجیے۔“ ”پھر سے شروع کیجیے۔“ ”پانچ سو گرام بنائیے۔“ میرے ساتھی ہنسنے لگے۔ اُن میں سے ایک نے کہا: ”کلابریا کے آدمی سے ٹکر لینا شاذ ہی کوئی سمجھ داری کا کاروباری قدم ہوتا ہے۔“ آخرکار صحیح پلیٹ آ گئی۔ ہم نے کھایا۔ سب خوش تھے۔ میرے ساتھیوں نے میرے کھانے کا بل ادا کیا۔ سسلی کے دونوں بھائیوں نے مجھے دیکھا اور پوچھا: ”اب آپ خوش ہیں؟“ میں نے کہا نہیں۔ وہ الجھے ہوئے دکھائی دیے۔ ”اب ہم امریکہ میں ہیں،“ میں نے کہا۔ ”اور یہاں آپ کی زبان کی قیمت ہے۔“ میں نے سو ڈالر نکالے اور ٹپ کے طور پر میز پر چھوڑ دیے۔ اُنہوں نے لینے سے انکار کر دیا۔ میں نے اصرار کیا۔ ”یہ میری مرضی ہے۔“ ”شاید ہم پھر کبھی ایک دوسرے سے نہ ملیں۔“ ”مگر میں یہ یہاں اس لیے چھوڑ رہا ہوں کہ آپ کی غلطی مجھے 120 گرام پاستا میں پڑی۔“ وہ مجھے گھورتے رہے۔ پھر وہ ہنس پڑے۔ اور میں بھی۔ کیونکہ کبھی کبھی اصول سنجیدہ ہوتے ہیں۔ اور کبھی کبھی وہ پاستا کا بھیس بدل کر آتے ہیں۔

نینڈو

رفتار جیتی ہے

کامیابی سب سے طاقتور کی نہیں ہوتی۔ وہ سب سے تیز کی ہوتی ہے — اُن کی جو سوچتے ہیں، حرکت کرتے ہیں اور خود کو ڈھال لیتے ہیں اس سے پہلے کہ کسی اور کو یہ احساس بھی ہو کہ کھیل بدل چکا ہے۔ میں نے یہ ایک سے زیادہ بار سیکھا۔ برسوں پہلے میں ایک ایسے منصوبے پر کام کر رہا تھا جس میں میرے حریفوں کے پاس سب کچھ تھا: بڑی ٹیمیں، بہتر اوزار، زیادہ تجربہ۔ میرے پاس جو تھا وہ تھی رفتار۔ جب وہ پیچیدہ حکمتِ عملیاں بنا رہے تھے، میں پہلے ہی آزما رہا تھا، رد و بدل کر رہا تھا، درست کر رہا تھا، اور آگے بڑھ رہا تھا۔ چھوٹی چھوٹی جیتیں، ایک کے بعد ایک، یہاں تک کہ فاصلہ مٹ جاتا ہے۔ ناک آؤٹ نہیں — ضربوں کا ایک ناپا ٹلا ذخیرہ۔ رفتار نے کمزوری کو فتح میں بدل دیا۔ رفتار کا مطلب جلد بازی نہیں۔ اس کا مطلب ہے دوسروں سے پہلے حالات کو پڑھ لینا۔ کھلتا ہوا راستہ دیکھ لینا۔ تب عمل کرنا جب باقی سب ابھی سوچ ہی رہے ہوں۔ ایک اور بار، ایک اہم تقریب کے دوران، ایک تکنیکی خرابی نے سب کچھ ٹھپ کر دینے کا خطرہ پیدا کر دیا۔ لوگ لمبے، نفیس حل ڈھونڈنے لگے۔ میں نے ایسا نہیں کیا۔ میں نے چیزوں کو سادہ کیا، تیزی سے عمل کیا، اور تقریب کو زندہ رکھا۔ بے عیب نہیں — مگر کارگر۔ اور اصل زندگی میں کارگر ہونا ہی جیتتا ہے۔ تیز ہونے کا مطلب اندھا دھند ہونا نہیں۔ اس کا مطلب ہے اتنا تیار ہونا کہ بلا جھجک حرکت کی جا سکے۔ یہ تجربے سے سدھایا ہوا وجدان ہے۔ یہ وضاحتِ فکر کے سہارے کھڑی جرات ہے۔ یہ جاننا ہے کہ کھڑکی کب کھلتی ہے — اور چھلانگ لگا دینا۔ آج میں یہ نہیں پوچھتا کہ چیلنج کتنا بڑا ہے۔ میں پوچھتا ہوں کہ میں کتنی جلدی حرکت کر سکتا ہوں۔ کتنی تیزی سے پیش بینی کر سکتا ہوں۔ میں کتنی تیزی سے کسی مسئلے کو موقع میں بدل سکتا ہوں؟ رفتار لچک ہے۔ رفتار حکمتِ عملی ہے۔ رفتار خواب دیکھنے اور کر دکھانے کے درمیان کا فرق ہے۔ آخر میں بات سادہ ہے: طاقتور کمزور کو نہیں ہراتے۔ تیز سست کو ہراتے ہیں۔

نینڈو

سپر مارکیٹ میں میرا دن

ہفتے کے دن، صبح 9 بجے۔ میں ایک سادہ منصوبے کے ساتھ سپر مارکیٹ میں داخل ہوا: دودھ، ڈبل روٹی، پنیر۔ دس منٹ بعد میں سیریل والی راہداری میں تھا۔ پھر غیر ملکی چٹنیوں والی راہداری میں۔ پھر مسالوں کی ایک پراسرار دیوار کے سامنے، جو میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ تب تقدیر نے بھی شامل ہونے کا فیصلہ کیا۔ میری ملاقات دو جاپانی دوستوں سے ہو گئی جنہیں مشورہ چاہیے تھا — یہ نہیں کہ کیا خریدیں، بلکہ یہ کہ کہاں کھائیں۔ تیس منٹ بعد ہم دوپہر کا کھانا کھا رہے تھے۔ سہ پہر تک ہم پرانے دوستوں کی طرح شہر میں گھوم رہے تھے۔ شام کو میں پھر سپر مارکیٹ گیا۔ کوئی اصل وجہ نہیں۔ بس وہی واضح احساس کہ کسی چیز کی کمی ہے۔ میں نے خود کو بسکٹوں کی ایک نہ ختم ہونے والی قطار کو گھورتے پایا۔ کچھ پتا نہیں میں وہاں کیسے پہنچا۔ ٹرالی ایسی چیزوں سے بھری تھی جو میری صبح کی کائنات میں موجود ہی نہیں تھیں مگر اب ضروری لگ رہی تھیں۔ کاؤنٹر پر کیشیئر نے مجھے دیکھا، مسکرائی، اور پوچھا: ”کیا آپ کچھ خاص ڈھونڈ رہے تھے؟“ میں جواب میں مسکرایا۔ ”مجھے تو یہ بھی نہیں معلوم کہ یہ سب میرے پاس کیسے آ گیا۔“ اور تبھی بات میری سمجھ میں آئی: سپر مارکیٹ وہ جگہ نہیں جہاں تم چیزیں خریدتے ہو۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں تم بدلتے ہو۔ ضرورتیں خواہشیں بن جاتی ہیں۔ خواہشیں عقیدے بن جاتی ہیں۔ عقیدے بہانے بن جاتے ہیں۔ میں تین بھرے تھیلوں اور ایک خالی یقین کے ساتھ باہر نکلا۔ مجھے کسی چیز کی کمی نہیں تھی۔ میں نے بس ضرورت اور شور کو گڈمڈ کر دیا تھا۔

نینڈو

لوگوں کو سمجھنا

دنیا بھر میں گزارے چالیس برس تمہیں بہت کچھ سکھا دیتے ہیں۔ باقی تم ٹھوکریں کھا کر سیکھتے ہو، اُس بچے کی طرح جو چھوٹی سے چھوٹی بات پر دھیان دیتا ہے، کیونکہ کچھ بھی مفت نہیں اور ہر چیز کی ایک قیمت ہوتی ہے۔ تم وہی لے کر پہنچتے ہو جو تم ہو: تمہارا کردار، تمہاری تعلیم، تمہارا تجربہ۔ یہی چیز تمہیں کسی صورتِ حال میں داخل ہونے، اسے پڑھنے، اس کے مطابق ڈھلنے اور — ضرورت پڑے تو — باگ ڈور سنبھالنے دیتی ہے۔

مگر تم ہمیشہ مہمان ہی ہوتے ہو۔ کچھ لوگ بس مشکل ہوتے ہیں: دروں ہیں، پیچیدہ، عادتاً قنوطی۔ وہ ایک ایسی جہت میں جیتے ہیں جہاں صرف وہی اہم ہے جو ابھی ہو رہا ہے، اور تب بھی انہیں ثبوت چاہیے، تصدیق چاہیے، اور پہلی تصدیق کی دوسری تصدیق بھی۔ پھر اس کی الٹ قسم ہے: منظم ذہن۔ وہ جو منصوبہ بندی، طریقہ کار، پیداوار اور منافع پر کھڑا ہے۔ مینیجر۔ ایک ایسا شخص جو اہداف، فیصلوں اور 7 پی کی مشہور زنجیر سے بندھا ہوتا ہے۔ قسمت اچھی ہو تو تمہیں کوئی ایسا مل جاتا ہے جس کا تعلیمی پس منظر ٹھوس ہو اور جو دستیاب اوزار استعمال کرتا ہو، چاہے وہ کبھی کبھی یہ بھول جائے کہ زندگی میں متغیرات، حیرتیں اور کبھی کبھار کوئی دھماکا بھی شامل ہوتے ہیں۔ لوگوں کو سمجھنا سائنس نہیں۔ یہ نظم و ضبط ہے۔ اشاروں، حرکات، تضادات اور ٹائمنگ کا ایک دھیمہ ذخیرہ۔ تم وہ دیکھنا سیکھتے ہو جسے دوسرے نظرانداز کر دیتے ہیں۔ تم وہ سننا سیکھتے ہو جو کہا نہیں جاتا۔ تم سیکھتے ہو کہ ہر کوئی اپنے اندر ایک نجی منطق لیے پھرتا ہے، اور اگر تم اسے پکڑ لو تو اُس سے صحیح سطح پر بات کر سکتے ہو۔ کچھ ملک ایسے ہیں جہاں لوگ سیدھی بات کرتے ہیں، کچھ ایسے جہاں گھما پھرا کر بات کرتے ہیں، اور کچھ ایسے جہاں صرف ضرورت پڑے پر بات کرتے ہیں۔ کافی عرصہ سفر کرو تو تم فیصلے سننا چھوڑ دیتے ہو۔ تم بس دیکھتے ہو۔ اور آخر کار تم سمجھ جاتے ہو۔ کیونکہ اصل ہنر — واحد ہنر جو اہمیت رکھتا ہے — سادہ ہے: لوگوں کو پڑھنا آنا۔

نینڈو

Auchan میں گڑبڑ

اُس صبح میرا کام کرنے کا موڈ نہیں تھا۔ ایسا اچھے اچھوں کے ساتھ ہوتا ہے — اگرچہ میں ابھی اُن میں شامل نہیں تھا۔ میں آدھی اونچی گھاس کے کھیتوں کے بیچ سے گاڑی چلاتا گیا، ایک طرف مردہ ہونے کا ناک کرتے سانپ، دوسری طرف حد سے بڑے دیہاتی چوہے۔ ایک ایسے آدمی کے لیے ایک غیر حقیقی سا سفر جس کی جیب میں دس یورو تھے اور پنشن آنے میں دس دن باقی۔ نیویارک میں شوفر والی لیموزینوں سے یہاں تک۔ زندگی بھی مذاق کرنا جانتی ہے۔ دروازے پر استقبالیہ ڈیسک والی لڑکی نے مجھے غسل خانے کا راستہ بتایا۔ نمایاں ہونے کے لیے میں نے اُس سے کہا، ”شکریہ، میری جان،“ اور ہوا میں ایک بوسہ اُچھال دیا۔ اُس نے مجھے مسکراہٹ +

شک کا وہ پرتگالی آمیزہ دیا، دھیمی ٹائمنگ اور خاموش جھجک والی واسکو ڈی گاما کی میراث۔ Auchan کے اندر پکے ہوئے کھانے کی خوشبو نے مجھ پر زوردار حملہ کیا۔ میں پندرہ منٹ تک کھانوں کو یوں تکتا رہا جیسے کوئی زائر کسی مزار کے سامنے۔ پھر مجھے سیلف سروس کاؤنٹر مل گیا: پہلے سے پکا ہوا کھانا، اٹھانے کو تیار۔ بس ایک مسئلہ — چیک آؤٹ تک 120 میٹر، پھر اسے کھانے کے لیے 120 میٹر واپس۔ میرے جیسے آدمی کے لیے ایک لاجسٹک المیہ۔ میں نے بھنے ہوئے مرغ کا 750 گرام کا ڈبا اٹھایا، بیٹھ گیا اور اسے چٹ کر ڈالا۔ میرے سامنے بیٹھی عورت خاموشی سے، محظوظ ہو کر دیکھتی رہی۔ ابھی بھی بھوکا تھا، سو میں واپس گیا، دوسرا ڈبا اٹھایا اور خود سے وعدہ کیا کہ پیسے بعد میں دوں گا — بس اس لیے کہ میرا ہاضمہ میرے ضمیر کے ساتھ ہم آہنگ رہے۔ میں نے فریج کھولا اور سوڈا واٹر لے لیا۔ وہ عورت وہیں رہی۔ وہ اگلا حصہ دیکھنا چاہتی تھی۔ دوسرا ڈبا ختم کر کے، کیشیئر کے پاس جانے سے پہلے میں ہاتھ دھونے گیا۔ مگر صفائی والی عورت میری میز پہلے ہی صاف کر چکی تھی۔ نہ ڈبے۔ نہ قیمت۔ نہ بارکوڈ۔ ایک مکمل جائے واردات — میرے ہی خلاف۔ تو میں نے تیسرا ڈبا اور پانی اٹھایا اور کیشیئر کے پاس گیا، اپنی بہترین ہسپانوی میں سب کچھ سمجھاتے ہوئے۔ تھوڑی الجھن کے بعد اُس نے میری پہلی رسید منسوخ کی، اضافی چیزیں اسکین کیں اور مجھے 2.54 یورو بقایا لوٹا دیے۔ آخری حساب: 6.10 یورو میں میں 2.6 کلو پکے ہوئے مرغ اور منزل واٹر کی ایک بوتل لے کر باہر نکلا۔ اور بھی لے سکتا تھا، مگر میرے ضمیر نے — جو ہمیشہ کی طرح زچ کرتا ہے — مجھے روک لیا۔ فرانسیسی تاجر محبت نہیں جگاتے، اور آج میں اُن کا بن بلایا مہمان رہا تھا۔

نینڈو

سب سے مشکل گاہک

”میری زندگی کا سب سے مشکل گاہک۔ الٹی گنتی: میں بچ نکلوں گا یا ڈھے جاؤں گا؟“ جب رات آتی ہے تو میں اُن کاموں کے بارے میں سوچتا ہوں جو مجھے دن میں کر لینے چاہیے تھے، اور خود سے کہتا ہوں: کل سب کچھ نمٹانے کے لیے بالکل صحیح دن ہوگا۔ یعنی — اگر باس مجھے تھوڑی اور مہلت دینے پر راضی ہو جائے۔ کیونکہ اُس کے ساتھ کوئی مول تول نہیں ہوتا۔ جب وہ بلاتا ہے تو پہلے خبردار نہیں کرتا۔ بس تمہیں لے جاتا ہے۔ وہ ایک

مشکل گاہک ہے۔ نہیں — ایک ناممکن گاہک۔ واحد۔ اور آج، ساٹھ سے زیادہ برس بیچنے کے لیے وقف کرنے کے بعد، میں تمہیں اُس کے بارے میں بتانا چاہتا ہوں: میرا سب سے مشکل گاہک۔ کچھ لوگ کہہ سکتے ہیں: ”ذرا رکھے۔ آپ اکسٹھ برس کے ہیں۔ آپ فروخت میں ساٹھ برسوں کی بات کیسے کر سکتے ہیں؟“ میرا جواب ایک مسکراہٹ کے ساتھ آتا۔ جب ہم پیدا ہوتے ہیں تو پہلی اصل چیز جو ہم بیچتے ہیں... وہ خود ہم ہیں۔ ہمارا رویہ وہ چابی ہے جو دروازے کھولتی ہے — اور کبھی کبھی اُنہیں بند بھی کر دیتی ہے۔ باقی سب کچھ ہمارے اعمال کے اندر رہ جاتا ہے۔ اور پچھلے دنوں ایک رات، جب پراسیکیوٹر نے مجھ سے پوچھا کہ میرا پیشہ کیا ہے، تو میں نے جواب دیا: ”چور۔“ اُس نے سیدھا میری آنکھوں میں دیکھا — سرد، سخت، پلک جھپکائے بغیر۔ پھر میں نے باقی حصہ جوڑ دیا۔ ”...دلوں کا۔“ ہاہا۔ شام بخیر۔ اور فروخت اچھی رہے۔

نینڈو

رابطہ

میں نے 2022 میں شروعات کی، باقی سب کی طرح، یہ سوچ کر کہ کتابیں بیچوں گا اور امیر مصنفوں کے اُس 1% میں شامل ہو جاؤں گا۔ پھر، جیسے جیسے برس گزرتے گئے، مجھے احساس ہوا کہ انجام تو دوسرے پہلے ہی لکھ چکے تھے۔ میرا انجام مختلف ہونا تھا۔ غیر متوقع۔ 2025 تک پہلے حقائق میز پر تھے: تین ویب سائٹس، باسٹھ ای بکس، 220 زبانیں، 2300 اشاعتیں، 106 پوسٹس۔ یہ تو بس بھوک چمکانے کو تھا۔ پہلا کورس ابھی بھی مفت تھا۔ دوسرا تھا انٹرویو۔ اور ساتھ کی ڈش تھی، پیسہ نہیں۔ اچھا حصہ تو ابھی شروع بھی نہیں ہوا تھا۔ انٹرویو کے معاملے میں، متجسس لوگ پہلے ہی خود کو باہر کر چکے تھے۔ میں کسی خاص شخص کا انتظار نہیں کر رہا تھا۔ بس ایک آدمی اور اُس کی مسکراہٹ۔ مگر مجھے یہ خیال لبھاتا تھا کہ وہ کوئی امریکی عورت ہو سکتی ہے — بہت ذہین — یہ جانے بغیر کہ وہ کون ہے، بغیر کسی نوآر خیال آرائی کے۔ شاید ایک خواب۔ اُن خوابوں میں سے ایک جو اگر تمہارے پاس نہ ہوں تو تمہارا کوئی مستقبل نہیں ہوتا۔ اور پھر فون بجا۔ کوڈ +1۔ بچ نکلنے کا کوئی راستہ نہیں۔ کال میرے گھر سے آ رہی تھی — میرے امریکہ سے۔ ”صبح بخیر، میں مارگریٹ ہوں، نیویارک سے بول رہی ہوں۔ میری اطالوی کے لیے معاف کیجیے گا، میں میڈیا چینل کی مینیجر

ہوں... امید ہے میں آپ کو پریشان نہیں کر رہی۔ کیا میری بات مسٹر فریگا سن سے ہو رہی ہے؟ کیا آپ کے پاس میرے لیے وقت ہے؟" یہ وہی ہے — وہ عورت جس کا میں انتظار کرتا رہا ہوں۔ مگر احتیاط کبھی زیادہ نہیں ہوتی۔ "جی، میں ہی ہوں۔ میں آپ کے لیے کیا کر سکتا ہوں؟" "میں آپ کو جاننا چاہوں گی۔" "کیا آپ کو کسی بوائے فرینڈ کی تلاش ہے؟" "نہیں، ہا ہا ہا۔ بس ایک انٹرویو۔" میں اُس کا نمبر مانگتا ہوں تاکہ 15 منٹ میں اُسے واپس فون کر سکوں، غسل خانے سے نکل آؤں اور اس جذباتی جھٹکے سے سنبھل جاؤں۔ وہ مان جاتی ہے۔ میں واپس فون کرتا ہوں۔ ایک سوئچ بورڈ جواب دیتا ہے۔ شناخت میں کوئی شک نہیں رہتا: یہ اُس کا امریکی نیٹ ورک ہے۔ وہ مجھے اُس کے دفتر میں منتقل کر دیتے ہیں۔ پہلا فلٹر: اُس کا اسسٹنٹ۔ پھر وہ خود۔ ہم بات چیت شروع کرتے ہیں۔ گیارہ منٹ۔ سوالوں اور جوابوں کے لیے کافی۔ مگر مجھے حتمی تصدیق دینے سے پہلے اُسے اپنے بورڈ سے بات کرنی ہے۔ وہ اس ذمہ داری کو اہم سمجھتے ہیں۔ وہ امریکی ہیں: اگر ایک لگائیں تو کم از کم 2.5 واپس آنے چاہئیں۔ وہ میری زبان سے چکرا جاتی ہے، حالانکہ وہ میری ماں کو اچھی طرح جانتی ہے۔ مگر یہ پہلی بار ہے کہ وہ اُس کے کسی اطالوی بیٹے سے مل رہی ہے۔ وہ میری عمر پوچھتی ہے، مگر پہلے مجھے بتاتی ہے کہ وہ اکتالیس برس کی ہے۔ میں جواب دیتا ہوں: "اس پر منحصر ہے کہ آپ کون سی لینا چاہتی ہیں۔ میں تین عمروں والا آدمی ہوں: ذہن اسی کا، دل چالیس کا، قربت اٹھارہ کی۔" وہ پاگلوں کی طرح ہنسنے لگتی ہے۔ وہ انٹرویو شروع کر چکی ہے اور یہ جانتی ہے۔ مگر جو اس کے بعد آتا ہے وہ اُسے جکڑ لیتا ہے۔ "نیویارک میں دوپہر کے 12:45 ہیں۔ دو گھنٹے میں میں آپ کو جواب کے ساتھ فون کروں گی۔ مگر مجھ سے وعدہ کیجیے کہ آپ کسی اور کو زبان نہیں دیں گے۔" ایک کلابریائی کے لیے زبان ہی عزت ہے۔ ہوا میں اچھالے گئے بے خوشبو حروفِ علت نہیں۔ وہ ہنستی رہتی ہے۔ ہم نے کال ختم کی۔ اُس کی ٹائمنگ میری ٹائمنگ نہیں۔ سب کچھ یہیں سے شروع ہوتا ہے۔ مگر یہ ابھی، اسی لمحے ختم بھی ہو سکتا ہے۔

نینڈو

نیاریاں

14:45۔ فون پھر بجتا ہے۔ مارگریٹ۔ اُس کے لہجے میں خوشی ہے، جوش ہے — جیسے کسی نے ابھی ابھی کچھ جیتا ہو۔ مگر کیا؟ ”نینڈو،“ فون پر وہ مجھے یہی کہہ کر پکارتی ہے، ”اپنی ٹرالی تیار کر لیجیے۔ ہم روانہ ہو رہے ہیں۔“ ”رومانوی سیر،“ میں جواب دیتا ہوں۔ وہ ہنستی رہتی ہے۔ پھر وہ منصوبہ سامنے رکھتی ہے: 23 جون 2026 — ریجیو کلابریا ← روم، پرواز صبح 06:30، آمد صبح 08:10۔ اسی دن، روم ← نیویارک، بزنس کلاس، صبح 10:40، JFK پر آمد 17:10۔ JFK پر ڈرائیور اور لیموزین، پورے قیام کے دوران دستیاب۔ مین ہیٹن میں سویٹ، 15 دن، سب سے اوپر کی منزل، سینٹرل پارک کا نظارہ۔ 10 ہزار USD والا ڈیٹ کارڈ + 3000 USD نقد، کمرے میں منتظر۔ ”کیا یہ تاریخیں اور تفصیلات آپ کے لیے ٹھیک ہیں؟“ ”جی،“ میں کہتا ہوں، ”مگر کم از کم یہ تو بتائیے کہ آپ کو کیا پسند ہے۔ اگر ہم رومانوی سیر پر جا رہے ہیں تو مجھے تفصیلات چاہئیں: Sprite، سفید شراب یا شیمپین؟“ اور پھر: ”ٹرین میں آپ کو اوپر والی برتھ پسند ہے یا نیچے والی؟“ ”ہا ہا ہا۔“ وہ آپ سے باہر ہو جاتی ہے۔ ”اگر آپ یوں ہی بولتے رہے تو میں ابھی اُڑ کر آپ کے پاس آ جاؤں گی۔“ ”اگر آپ تاریخوں سے متفق ہیں،“ وہ بات جاری رکھتی ہے، ”تو میں آپ کو ابتدائی معاہدے کا وہ مسودہ بھیج دوں گی جو ہم تیار کر رہے ہیں۔ پھر ہم تفصیلات طے کر لیں گے۔“ یہ وہ سب کچھ ہے جس کی مجھے توقع نہیں۔ فون رکھنے سے پہلے وہ اضافہ کرتی ہے: ”ارے، تقریباً بھول ہی گئی تھی: اگر آپ مجھے غیر رسمی ہاں بھی کہہ دیں تو میں Goldman Sachs کو فون کروں گی تاکہ ون لبرٹی پلازا کی 54 ویں منزل والا کمرہ دستیاب کر دیا جائے۔“ ”مگر آپ جانتی ہیں کہ وہ کمرہ مالکوں کا ہے اور کرائے پر نہیں دیا جاتا؟“ ”جی، جانتی ہوں۔ یہی تو خوبصورتی ہے۔“ میں سانس لیتا ہوں۔ کچھ گھنٹے مانگتا ہوں۔ اُس سے کہتا ہوں کہ واپس فون کروں گا۔ وہ طغیانی میں آیا ہوا دریا ہے، لاوے کے بغیر آتش فشاں — اپنے کام کے جنون میں جلتی ہوئی، اُس کے بعد پیشہ ورانہ مہارت، اور پھر اُس کا عورت ہونا، جس کی خوشبو اُس کے پہلے لفظوں ہی سے آ جاتی ہے۔ میری بیوی کمرے میں آتی ہے۔ میرا سفید پڑا چہرہ دیکھتی ہے۔ پوچھتی ہے کہ کیا میں نے کوئی بھوت دیکھ لیا۔ ”ہاں،“ میں جواب دیتا ہوں۔ ”مگر اس کا جسم بھی ہے اور ایک خوبصورت ذہن بھی۔“

پیسہ نہیں

میں ای میل کھولتا ہوں۔ ابتدائی معاہدے کا مسودہ وہاں موجود ہے۔ دو زبانیں: انگریزی اور اطالوی۔ وہ سب کچھ مان لیتے ہیں۔ وہ فوراً پیشگی رقم بھیجنے کو بھی تیار ہیں، اور باقی رقم انٹرویو سے پہلے۔ بس انہیں رقم بتا دوں۔ وہ انٹرویو کے لیے، کیمرے پر، 1 USD ادا کریں گے۔ مجھے باہر جانا ہے۔ چلنا ہے۔ سوچنا ہے۔ جس جس چیز کی مجھے توقع تھی، وہ ہو رہی تھی۔ جو کچھ میں نے تصور کیا تھا۔ مگر یہ وہ نہیں جو میں چاہتا ہوں۔ میں نے اگلے دن اُس سے رابطہ کیا اور اُسے یہ کہا: پروازیں پکی — صرف اکانومی، بزنس نہیں۔ نہ لیموزین، نہ ڈرائیور — میں اکیلا سب وے، بس یا ٹیکسی لوں گا۔ نہ سویٹ — میں کوئنز میں Airbnb کا ایک اسٹوڈیو کرائے پر لوں گا اور وہیں سے آؤں جاؤں گا۔ کوئی پیشگی رقم نہیں۔ جہاں تک رسائی کی فیس کا تعلق ہے، ہم یہ کریں گے: 1000 چیک تیار کیجیے، ہر ایک 1000 USD کا۔ انہیں انگریزی زبان کے ایسے 1000 مصنفین کو بھیجیے جنہیں کامیابی نہیں ملی مگر جن کی کم از کم تین کتابیں چھپ چکی ہوں۔ لفافے کے اندر: ایک چیک اور میرا ایک خط۔ اگر میری درخواست قابل قبول ہے تو ہم آگے بڑھتے ہیں۔ اگر نہیں، تو یہ میرے لیے خوشی کی بات رہی۔ اور اُس ادارتی مواد کا شکریہ جو آپ نے مجھے دیا ہے — مزید کہانیاں لکھنے کے لیے کافی، جیسا کہ میں پچھلے برسوں میں کرتا آیا ہوں۔

1000 USD والا خط

آپ کو یہ معاونت نہ خیرات کے طور پر مل رہی ہے، نہ سخاوت کے کسی عمل کے طور پر۔ میں اس کام کے لیے پیدا نہیں ہوا — نہ ہی جینیاتی طور پر اس پر مامور کیا گیا ہوں۔ میں اسے صرف آپ کو یہ یاد دلانے کے لیے بھیج رہا ہوں کہ آپ ایک آزاد مصنف بن سکتے ہیں اگر اپنا کام مفت دے دیں اور پیسے کی لذت کے بارے میں سوچنا چھوڑ دیں۔ صرف پڑھے جانے اور پہچانے جانے کی خوشی پر توجہ دیجیے۔ یہ اشاعت کا کوئی نیا طریقہ نہیں۔ یہ وہی طریقہ ہے جس سے انسانوں نے اپنا اظہار کرنا شروع کیا تھا۔ بس یاد رکھیے: پہلے شخص نے یہ 2000 برس پہلے کیا تھا۔ مجھے امید ہے کہ میں نے آپ کو

اپنی توجہ جذباتی ارادوں کے بغیر دی ہے، منطقی اور عقلی ارادوں کے ساتھ، جیسا کہ صرف سچے لکھنے والے ہی کرنا جانتے ہیں۔

نینڈو

ایک معصوم سبق

میں نے انہیں فون کیا اور پوچھا کہ وہ کس علاقے میں کام کر رہے ہیں۔ مجھے احساس ہوا کہ میں صرف ساٹھ کلومیٹر دور تھا، سو میں نے اُن سے کہا کہ دوپہر کا کھانا ساتھ کھائیں۔ دو مہینے پہلے کی ہماری آخری کاروباری میٹنگ کے بعد سے میں نے انہیں نہیں دیکھا تھا۔ میں اُن کے ہوٹل پہنچا اور رات کے لیے ایک کمرہ بک کر لیا۔ میں وہیں رہنا چاہتا تھا۔ مجھے اُن کی موجودگی چاہیے تھی، اُن کے لطیفے، اُن کے وہ ادھورے جملے جو پوری تقریر سے زیادہ کہہ جاتے تھے۔ وہ میرے والد تھے۔ میز پر بیٹھ کر ہم نے دن کی خاص ڈش منگوائی۔ اُن کی بھوک کبھی ختم نہیں ہوئی تھی — نہ کھانے کی، نہ عورتوں کے چوتڑوں کی، جو اُن کا اصل جنون تھے۔ ایک کورس اور اگلے کے بیچ وہ نئی ویٹرس کو دیکھ کر ہنستے رہے جو اپنی نوکری نہ کھونے کے لیے انتظامیہ کو متاثر کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ہم نے سہ پہر سمندر کے کنارے ٹہلتے ہوئے گزاری۔ مجھے احساس ہوا کہ میں کچھ ایسا کر رہا تھا جس پر بچے کم ہی دھیان دیتے ہیں: میں اپنے والد کے ساتھ اُس لمحے کا لطف اٹھا رہا تھا۔ میں اُن کے ساتھ وقت گزار رہا تھا — باپ، ساتھی کارکن، دوست، شریک جرم اور ادراکی شعبہ باز۔ ہوٹل واپس آ کر انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ میں اُس شام کیا کر رہا ہوں۔ ”ظاہر ہے، ایسی جگہ پر آس پاس میری کوئی سہیلی تو ہونی ہی چاہیے۔ میں اُسے فون کروں گا اور ہم ساتھ باہر جائیں گے۔“ انہوں نے سیدھا میری آنکھوں میں دیکھا اور کہا، ”اور میں کیا کروں، یہاں اکیلا بیٹھا رہوں؟“ وہ میرے والد تھے۔ میں نے جواب دیا، ”مجھے تھوڑا وقت دیں، دیکھتا ہوں آپ کے لیے بھی کوئی سہیلی ڈھونڈ سکتوں، اور ہم چاروں باہر چلیں گے۔“ انہوں نے سر ہلایا اور خاموشی سے مسکرا دیے۔ وہ جانتے تھے کہ وعدہ ہمیشہ کسی معاہدے پر دستخط سے پہلے آتا ہے۔ یہ قانون تھا۔ میں نے سارا انتظام کر دیا، اور میری سہیلی اپنی چھوٹی بہن کو ساتھ لے آئی۔ ہم گویا ایک خاندان بن کر کھیل رہے تھے۔ مگر میں نے اپنے والد سے کہا کہ یہ ظاہر نہ کریں کہ وہ کون ہیں — انہیں اپنا تعارف صرف میرے ساتھ کارکن اور دوست کے طور پر کرانا تھا۔ وہ مان

گئے، کم از کم نیت کی حد تک۔ ہم بیئر پینے اور ہاٹ ڈاگ کھانے ایک پب میں گئے۔ گفتگو کی باگ ڈور، ہمیشہ کی طرح، اُنہی کے ہاتھ میں تھی۔ اور دونوں عورتوں میں سے ایک نے، اپنی جبلت کی رہنمائی میں، کہا: ”آپ دونوں ہوہو ایک جیسے ہیں۔ مجھے یقین نہیں آتا کہ آپ بس ساتھی کارکن ہیں۔“ یہی وہ لمحہ تھا جب اُنہوں نے کہا: ”جی ہاں، سچ ہے، مس۔ میں اس کا باپ ہوں۔“ اور سب کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ رات ختم ہو رہی تھی۔ جب ہم نکلنے کو تیار تھے، میں اُنہیں الوداع کہہ رہا تھا اور اُنہوں نے پوچھا: ”تو کیا، تم مجھے اکیلا چھوڑ کر جا رہے ہو؟“ لڑکیاں فوراً سمجھ گئیں — مجھ سے بھی زیادہ — اور دونوں ساتھ ہی رخصت ہو گئیں۔ میں اپنے والد کے ساتھ ہوٹل لوٹ آیا، اور ہم ساری رات ہنستے رہے۔ اُن کی واحد ہدایت یہ تھی کہ میری ماں کو نہ بتاؤں۔ مگر اُنہوں نے، کھرے اور محبت میں ڈوبے ہوئے، فوراً اُنہیں بتا دیا۔ وہ مسکرائیں، اور اُس خاموش نگاہ کے پیچھے سے اُنہوں نے مجھے سمجھا دیا کہ میں ایک پکے حرامی کے سوا کچھ نہیں۔ ایک سبق جو عمر بھر ساتھ رہتا ہے: کبھی جھوٹ مت بولو — خاص طور پر عورتوں سے۔ اگر واقعی بولنا ہی پڑے تو آدھے سچ سے کام لو۔ مگر اگر تم دل کی گہرائی تک اچھے ہو، یا بننے کی کوشش کرنا چاہتے ہو، تو کچھ بھی مت کہو اور مسکرا دو۔ ہمدلی ہمیشہ خاموشی کو بھر دیتی ہے۔

نینڈو

”مجھے یہ احساس کہ ہم ایک جیسے تھے، تب ہی ہوا جب وہ باپ کے گھر لوٹ چکے تھے — اب اس زمین پر نہیں۔“

امریکی انڈے

طیارہ ابھی ابھی اترتا تھا۔ میری بیوی اور بیٹی دونوں حیران بھی تھیں اور مشکوک بھی: ایک نئی شروعات بے یقینی میں بدل گئی تھی، اور اتنے سارے لوگوں کو ایک مختلف زبان بولتے سننا اُن کے لیے بالکل نئی بات تھی۔ نیویارک کا JFK ایئرپورٹ ہمارا استقبال کر رہا تھا۔ میرے لیے اس کا مطلب تھا گھر لوٹنا — اپنی سرزمین پر — جو شناخت کے ایک وعدے سے بدل کر ایک فتح اور ایک نیا زاویہ نظر بن چکی تھی۔ مختصر یہ کہ: 61 برس پہلے جب لُق کو مجھے نیویارک میں اتارنا تھا، تو وہ کلابریا کے ایک باز کی چمک دمک سے چندھیا کر اُس پر فریفتہ ہو گئی اور اُس نے مجھے

آسپرومونتے کے پہاڑوں کی ڈھلانوں پر چھوڑ دینے کا فیصلہ کیا۔ مگر وہ ایک الگ کہانی ہے۔ ہم نے سامان اٹھایا اور ایک پیلی ٹیکسی میں بیٹھ گئے۔ ڈرائیور نے پوچھا کہ ہم کہاں جا رہے ہیں، اور میں نے اُسے پتا بتا دیا۔ پھر اُس نے پوچھا کہ ہم کہاں سے آ رہے ہیں اور میں اصل میں کہاں کا ہوں۔ میں نے جواب دیا، "کوئٹہ، نیویارک۔" راستے بھر مکمل خاموشی۔ جب ہم پہنچے تو میں نے کرایہ پوچھا: "کارڈ سے USD 22؛ نقد دیں تو USD 14۔" میں نے دوستانہ نیت سے اُس کی طرف دیکھا، اور اُس نے کہا، "میں نے 12 برس نیپلز میں کام کیا ہے اور وہیں سیکھا کہ صرف اسی طرح میں اپنی لتوں کا خرچ اٹھاتا رہ سکتا ہوں۔ اور سامان دیکھ کر ہی میں سمجھ گیا تھا کہ آپ اٹلی سے آ رہے ہیں۔ نیویارک میں خوش آمدید۔" گھر نیا اور خوبصورت تھا، گلی کی طرف سے ایک ہی دروازہ اور چڑھنے کو بس چند سیڑھیاں۔ دونوں عورتوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور اپنی خاموشیوں سے باتیں کیں — مگر میں، پیدائش سے اپنے اندر نصب "نسوانی کوڈ" کے سہارے، اُن کی نگاہوں کے پیچھے چھپے رنگ اور خیال پڑھ سکتا تھا۔ "ہم گھر پہنچ گئے،" میں نے اُن سے کہا۔ "بعد میں میں کچھ سودا سلف لے آؤں گا۔" میں کھانے پینے کا سامان بھرنے باہر نکلا۔ مجھے سپر مارکیٹیں پسند نہیں: Walmart سب کا استقبال کرتی ہے، مگر Walmart میں گاہک بھاری قیمت چکاتے ہیں۔ میرے سپلائر آج بھی چھوٹی مقامی دکانیں ہیں، وہ جگہیں جہاں دو باتیں یا ایک مذاق کر کے میں اصلی خبریں جمع کر لیتا ہوں — اور اپنی زندگی کے بارے میں لکھتا ہوں۔ "اور انڈے، جیک، تازہ کہاں سے خرید سکتا ہوں؟" "اس گلی کے پیچھے کان نام کا ایک ترک ہے۔ اُس کی اپنی کچھ مرغیاں ہیں جن کی وہ بڑی احتیاط سے رکھوالی کرتا ہے۔ دیکھیے، شاید اُس کے پاس وہ ہو جو آپ ڈھونڈ رہے ہیں۔" چند قدم بعد میں پہنچ گیا۔ وہ اطالوی بھی بولتا تھا — اور یہیں سے حیرتوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ وہ مجھے اپنی مرغیاں دکھانے دکان کے پچھلے حصے میں لے گیا: میں نے صرف نو گئیں، اور اُن میں سے ایک کے پروں پر اطالوی جھنڈے کے رنگوں والا ایک دھیا تھا۔ تجسس سے میں نے پوچھا کہ اس کا کیا مطلب ہے۔ فخر سے اُس نے کہا، "یہ کامیلا ہے۔ یہ اٹلی سے آئی ہے، نیپلز سے — فورچیلا کے محلے سے۔ میرے چچا نے مجھے دی تھی۔ یہ کمال کے انڈے دیتی ہے۔ یہ ایسے انڈے ہیں جنہیں آپ تازہ ہی پی سکتے ہیں، پکانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں اپنی ان بیگمات کو کبھی کیمیکل نہیں کھلاتا — صرف قدرتی خوراک، جیسے ہم ترکی میں کرتے ہیں۔" اُس نے پوچھا کہ کیا میں کچھ چکھنا چاہوں گا، اور ظاہر ہے، میں نے ہاں کر دی۔

”اس سے بہتر موقع اور کیا ہوگا؟“ ہم دکان کے اندر ایک چھوٹی سی میز پر بیٹھ کر گپ شپ کرنے لگے، اور وہ میرے لیے تین انڈوں والی ایک پلیٹ لے آیا۔ ”ابھی ابھی میری کامیلا نے دیے ہیں۔ نینڈو، آپ خوش قسمت آدمی ہیں،“ اُس نے کہا۔ چھونے پر وہ گرم تھے۔ بات آگے بڑھانے سے پہلے میں نے اُس کے بیٹھنے کا انتظار کیا۔ اُس نے پوچھا کہ میں کیا پینا چاہوں گا۔ ”امریکی کافی، براہ کرم۔“ میں نے پہلے انڈے میں سوراخ کرنا شروع کیا — مگر سوراخ ہوا ہی نہیں۔ میں نے دوسرا آزمایا، پھر آخری۔ تینوں سخت اُبلے ہوئے تھے۔ ... ایک معجزہ۔ ہم امریکہ میں تھے۔ ایک مرغی جو پہلے سے اُبلے ہوئے انڈے دیتی ہے — پکانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں نے نہ حیرت ظاہر کی نہ گھبراہٹ؛ بس کان سے پوچھا کہ وہ کامیلا کو کتنے میں بیچنا چاہے گا۔ اُس نے پوچھا کیوں۔ وہ مسکرایا، ”انڈے پسند آتے؟“ میں نے اُسے بتایا کہ میں اسے اپنی بیٹی کو دینا چاہتا ہوں، جسے مرغیاں بہت پسند ہیں۔ اندر ہی اندر میں سوچ رہا تھا کہ یا تو یہ دس لاکھ ڈالر کا پروجیکٹ ہے... یا کوئی فراڈ جسے ابھی سمجھنا باقی ہے۔ میں نے پیسے دیے، الوداع کہا اور چلا آیا۔ میں نے کسی سے کچھ ذکر نہیں کیا، مگر اگلے دن میں پھر گیا۔ ”صبح بخیر، کان۔ کیا آج مجھے کچھ اور پینے والے انڈے مل سکتے ہیں؟“ ”ضرور، تشریف رکھیے۔ میں ابھی لاتا ہوں۔“ ”میں ڈربے میں جا کر اُنہیں سیدھا کامیلا سے اٹھانا چاہوں گا۔“ ”معاف کیجیے گا، نینڈو، مگر کل رات ہم نے ایک سالگرہ کی دعوت کے لیے اسے پکا ڈالا۔ پر میں آپ کے لیے کچھ اور انڈے لے آتا ہوں۔“ وہی رسم، وہی میز، وہی پلیٹ: تین تازہ انڈے، پینے کے لیے — مگر ایک بار پھر سخت اُبلے ہوئے، اور کھانے کو تیار۔ میں نے پیسے دیے، باہر نکلا اور سوچا: امریکی خواب۔ یا شاید وہی مجھے ڈھونڈنے کی کوشش کر رہا ہے — اور ابھی تک ڈھونڈ نہیں پایا۔ امریکہ میں خوش آمدید۔

نینڈو

ٹریڈ مارک یا برانڈ

اپنے والد سے میں نے خاندانی نام یوں لیا جیسے وہ کوئی ٹریڈ مارک ہو۔ ہماری جڑیں ایک ایسے جدِ امجد کی بات کرتی ہیں جو تقریباً چھ سو برس پہلے، پرانے روس میں، ایک چور تھا، ایک ڈاکو۔ ایک فریگا۔ صرف ایک خوبی کے ساتھ: مہربانی۔ صرف ایک فضیلت کے ساتھ: محبت۔ یہ پہلی اور واحد دیومالائی یاد ہے۔ پھر طریقہ آیا۔ وہ، پہلے فوج میں افسر۔ پھر Gillette

اٹلی میں سیلزمین۔ ضابطے۔ منصوبہ بندی۔ پروگرامنگ۔ دورانِ دیشی۔ اور ایک اصول: اپنی کامیابیوں کی کبھی تشہیر مت کرو۔ چین سے جینے کے اصول۔ ایک فریگا کی طرح جینے کے اصول۔ پھر بھی اسٹیج کی روشنیاں، جو کبھی ہمارے پیکروں پر پڑتی دکھائی نہیں دیتی تھیں، سایوں میں بھی ہمارے خاکے کھینچ ہی دیتی تھیں۔ اور جب ہم سمجھتے تھے کہ ہم اکیلے ہیں، سو لوگ خاموشی سے ہمیں دیکھ رہے ہوتے، یہ سوچتے ہوئے کہ ہم آگے کیا کریں گے۔ فریگا کبھی زمین پر نہیں گرتے۔ وہ گھٹنے ٹیک سکتے ہیں۔ مگر پھر اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ ہمیشہ۔ کوئی واقعی نہیں جانتا کہ ہم کتنے غیر متوقع ہو سکتے ہیں، کیونکہ ہم خیالوں کو افسانہ نہیں بناتے۔ ہم انہیں تخلیقات بناتے ہیں۔ اور تخلیقات باقی رہتی ہیں۔ خاموشی۔ وقار۔ جذبات کی نمائش کا نہ ہونا۔ یہ سرد مہری نہیں۔ یہ طاقت کی تربیت ہے۔ ایسے مرد جو نہ مانگتے ہیں، نہ لیتے ہیں، نہ گڑگڑاتے ہیں۔ وہ سڑک کے کنارے کھڑے رہتے ہیں، اُس ایک کے انتظار میں جسے پانے کا خواب کسی نے کبھی نہیں دیکھا۔ اور پھر بھی فریگا کشش پیدا کرتے ہیں۔ نفسیاتی طب اسے ادراکی ہمدلی کہتی ہے۔ نفسیات اس کی تعریف کرنے سے کتراتے ہیں۔ معاشرہ اس پر جذباتی مرض کا ٹھپا لگا دیتا ہے۔ اور لوگ یہ جاننے سے پہلے ہی محبت میں گرفتار ہو جاتے ہیں کہ تم کون ہو۔ آج میں صرف وہی کہتا ہوں جو سوچتا ہوں۔ کیونکہ میری پرورش کا تقاضا ہے کہ میں اپنے اعمال سے بولوں۔ ادبی نوآر کے لیے وقت نہیں۔ اُس کی جگہ بھی نہیں۔ اگر ہم ایسی چیز کے طور پر پہچانے جانا چاہتے ہیں جو ابھی وجود ہی نہیں رکھتی: ایک نام جو برانڈ بن جاتا ہے۔ ضمانت۔ اعتبار۔ کوئی ایسی چیز جس کی کوئی قیمت نہیں۔ ایک ایسے عمل کے اندر جو نہ پہچانا گیا، نہ درجہ بند ہوا، پھر بھی نیا ہونے کی وجہ سے سراہا گیا۔ ایک قدیم ڈرامے سے جنم لیا ہوا: وجود۔ تم جو پڑھ رہے ہو، تمہارے لیے میری یہی دعا ہے: کہ تمہاری تحریر زندہ رہے، چھپی ہوئی نہیں۔ ناقابلِ فراموش، محض یاد رکھی جانے والی نہیں۔ کیونکہ کچھ نام پیدا ہوتے ہیں۔ اور وہ آسانی سے نہیں مرتے۔ وہ فریگا ہیں۔ سلام، ابا۔

نینڈو

بس ایک لمحہ

ہمیشہ ایک لمحہ ایسا آتا ہے جب سب کچھ خاموشی سے بدل جاتا ہے۔ زیادہ تر لوگ اُسے چوک جاتے ہیں۔ میں تب بھی خوش ہو سکتا ہوں جب

مجھے ایسے لوگ ملیں جو بس اچھے ہوں۔ لوگ جو مسکراتے ہیں، جن کی روح فطری طور پر بانٹنے کے لیے کھلی ہوتی ہے۔ اور اگر اتفاق سے میں اُس مسکراہٹ کا سبب ہوں، نتیجہ نہیں، تو اور بھی اچھا۔ کچھ مجھے تخلیقی سمجھتے ہیں۔ کچھ مجھے ڈیزائنر کہتے ہیں، امکان پرست، طنز پسند۔ کوئی اور سمجھتا ہے کہ میں ادراکی ہوں، ڈرامائی، ایک اداکار۔ دوسرے مجھے خواب دیکھنے والا کہتے ہیں۔ کچھ سمجھتے ہیں کہ میں پاگل ہوں۔ کچھ سمجھتے ہیں کہ میں پیش رو ہوں۔ ایسے لوگ بھی ہیں جو مانتے ہیں کہ میں زیادہ سمجھدار نہیں، یا سیدھا سیدھا بے وقوف ہوں۔ اس سے واقعی کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اصل حد دوسروں کی رائے میں نہیں، بلکہ اُس آخری مقصد میں ہے جس کا پیچھا کرنا کوئی چنتا ہے۔ حقیقت وہ نہیں جو کہی جاتی ہے۔ وہ ہے جو تم آخرکار ہوتے ہوئے دیکھتے ہو۔ آج میں ناراض نہیں ہوں۔ جب میں بس چند گھنٹوں کی نیند کے بعد جاگتا ہوں اور پھر بھی خوش محسوس کرتا ہوں تو جانتا ہوں کہ اُس احساس کو بانٹنے کا واحد طریقہ لکھنا ہے۔ جس دن میں نہیں لکھتا، اُس کا مطلب یہ نہیں کہ کچھ گڑبڑ ہے۔ اُس کا مطلب بس اتنا ہے کہ میں نے اپنی ترجیحات بدل لی ہیں۔ اُن لمحوں میں میں خود کو کسی اور کے لیے وقف کر دیتا ہوں۔ ہمیشہ اس امید میں کہ وہ کوئی عورت ہو، کیونکہ ماننا پڑے گا کہ اس سے مجھے زیادہ تسکین ملتی ہے۔ فلسفہ، نفسیات، نفسیاتی طب، ذہن، خیالات، تحریر، صحت، عورتیں — سب کچھ دماغ سے ہو کر گزرتا ہے۔ اور مجھے تمہیں ایک بات بتانی ہے: دماغ ایک عورت ہے۔ ہاہاہا۔ مجھے ایک شوہر یاد ہے جو اپنی بیوی سے بس محبت کا ایک چھوٹا سا لمحہ مانگا کرتا تھا۔ وہ ہمیشہ ہاں کہہ دیتی۔ اور یوں اُن کے اٹھ بچے ہو گئے۔ وہ ہمیشہ کہتا: ”تم دیکھنا، میں شرافت سے رہوں گا۔ بس ایک چھوٹا سا لمحہ۔“ وہ ماں بن گئی۔ پھر سے۔ آج جو میں ہوں، وہ بننا ایک خاص لمحے سے پیدا ہوا۔ اُسی لمحے میں نے فیصلہ کیا کہ فریگا خاندان کی ایک ایسی نسل بناؤں گا جسے پیسے کے لیے نہیں بلکہ ایک ادبی نقش کے لیے یاد رکھا جائے۔ جیسا تاریخ کے بہت سے عظیم ادیبوں کے ساتھ ہوا۔ جو بغیر پیسے کے مر گئے۔ ہاہاہا۔ سب کچھ ایک واحد لمحے کی وجہ سے۔ اسی لیے میں تم سے بس ایک چیز مانگتا ہوں: پڑھو۔ کچھ بھی۔ کیونکہ پڑھنا ہی اپنے ذہن کو جاگتا رکھنے کا واحد طریقہ ہے — چاہے بس ایک لمحے کے لیے۔

نینڈو

سفر اور قدم

تم ملک پار کرنے والے ہو۔ ہوائی جہاز، ٹرین، بس، کار یا سائیکل؟ انتخاب آسان لگتا ہے۔ تاہم اس میں دو شرطیں چھپی ہیں: تم کیا کر سکتے ہو اور تم کیا کرنا چاہتے ہو۔ وقت بعد میں آتا ہے۔ اس کے برعکس، اصل میں جو اپنا آپ منواتا ہے وہ فاصلہ ہے۔ تو اصل سوال ایک ہی ہے: تم جا کیوں رہے ہو؟ سب کچھ اسی پر منحصر ہے — سواری پر نہیں۔ پھر، ظاہر ہے، ساتھ کی باری آتی ہے۔ اکیلے ہونا یا کسی کے ساتھ ہونا سب کچھ بدل دیتا ہے۔ درحقیقت یہیں عقلی سلیم، افہام و تفہیم اور برداشت میدان میں اترتی ہیں — یا نہیں اترتیں، اور بات بکھر جاتی ہے۔ اس کے بعد پیسہ منظر پر آتا ہے۔ اصلی پیسہ۔ وہ جو تمہارے پاس ہے۔ ورنہ تم اسے ادھار لیتے ہو — ضرورت کے مطابق، یا اس حساب سے کہ تم کتنے بڑے فراڈ ہو۔ مگر مساوات کبھی نہیں بدلتی: تم جتنا زیادہ گھر سے دور رہو گے، اتنا ہی زیادہ خرچ کرو گے، اتنا ہی زیادہ پھونکو گے۔

بھولا ہوا انتخاب

اس سب سے تمہیں یہ طے کرنے میں مدد ملنی چاہیے کہ کیسے سفر کرو۔ پھر بھی بہترین طریقے کا ذکر تقریباً کبھی نہیں ہوتا: پیدل چلنا۔ جب تم پیدل چلتے ہو تو دنیا کی شکل بدل جاتی ہے۔ نتیجتاً، شکلیں ہی وہ پہلی چیز بن جاتی ہیں جس پر تمہاری نظر پڑتی ہے — اور وہیں تم رک کر قریب سے دیکھتے ہو۔ اس دوران خیالات عموماً سواری کے پیچھے چلتے ہیں، تمہاری ٹانگوں کے پیچھے نہیں۔ اس لیے کبھی کبھی بس ذرا اونچا قدم اٹھانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ بابا بابا۔

سواری ہٹا دو تو کیا بچتا ہے؟

سواری ہٹا دو تو جو بچتا ہے وہ تم ہو۔ پیدل کوئی تضاد نہیں ہوتا۔ کوئی تمہارا چالان نہیں کرتا۔ کوئی تمہاری رفتار نہیں ناپتا۔ کوئی تمہیں نہیں بتاتا کہ تمہیں کہاں ہونا چاہیے۔ تم آزاد ہو — شہر کے جہنم کے اندر بھی۔ آخر کار ہمیشہ یہی ہوتا ہے: ”اتنا دور تو نہیں تھا۔“ فاصلہ نہیں بدلتا۔ بلکہ تم خود سے جھوٹ بولنا چھوڑ دیتے ہو۔

یاد، عادت اور ایجاد

میرے آبا و اجداد پیدل چلتے تھے۔ یہ معمول کی بات تھی۔ پھر کسی موڑ پر میری خالہ کاترینا کو اُن کا عاشق بانہوں میں اٹھا کر لے گیا۔ وہیں سے کسی نے طے کر لیا کہ ایک روایت شروع ہو گئی ہے: دلہن اُس کی بانہوں میں، پہلا قدم، رسم۔ چیزیں یوں ہی چلتی ہیں۔ پہلے کوئی کچھ کرتا ہے۔ بعد میں وہ قاعدہ بن جاتا ہے۔ پیدل چلنا صحت کے لیے اچھا ہے۔ ٹھلنا صحت کے لیے اچھا ہے۔ سفر کرنا صحت کے لیے اچھا ہے۔ زندگی نہیں۔ زندگی ایک ایسا سفر ہے جو ہر حال میں شروع ہو جاتا ہے۔ تم جانتے ہو کہ وہ کہاں سے شروع ہوتا ہے۔ تم نہیں جانتے کہ وہ کہاں ختم ہوتا ہے۔

نینڈو

کام اور محبت

تم کون سا کام مفت کرو گے؟ وہ ہمیشہ یہی سمجھتا آیا تھا کہ کام ایک لین دین ہے — ایک صاف ستھرا تبادلہ: گھنٹوں کے بدلے پیسہ، محنت کے بدلے بقا، قابلیت کے بدلے منظوری۔ یہ پہلا اسطورہ تھا جو اُسے ورثے میں ملا، اس سے بہت پہلے کہ اُس نے کسی بھی چیز پر سوال اٹھانا سیکھا۔ اُس کے بچپن میں بڑے کام کی بات یوں کرتے تھے جیسے ملاح طوفانوں کی بات کرتے ہیں: ایک ایسی چیز جسے جھیلا جاتا ہے، چنا نہیں جاتا۔ مگر اسطورے چٹخ جاتے ہیں۔ ہمیشہ۔ دراڑ اُس دن پڑنی شروع ہوئی جب اُسے احساس ہوا کہ لوگ اپنے پیشے چنتے نہیں — اُنہیں ورثے میں پاتے ہیں۔ قانونی طور پر نہیں، نفسیاتی طور پر۔ وکیل کا بیٹا وکیل بنتا ہے۔ ڈاکٹر کی بیٹی ڈاکٹر بنتی ہے۔ نان بائی کا بیٹا بالکل ہی کچھ اور بنتا ہے، عموماً کوئی ”اونچی“ چیز، کیونکہ معاشرہ سرگوشی کرتا ہے کہ اوپر اٹھنے کا مطلب چھوڑ جانا ہے۔ پھر بھی اُس نے ایک عجیب بات نوٹ کی۔ جب لوگ اوپر چڑھ بھی جاتے، جب وہ اپنے ماں باپ کے سائے سے نکل بھی جاتے، تب بھی اکثر ایسی جگہوں پر جا پہنچتے جہاں کے وہ تھے ہی نہیں۔ وہ عہدے ادھار کے کوٹوں کی طرح پہنتے، جو کبھی پوری طرح ناپ کے نہ ہوتے، کبھی پوری طرح اُن کے اپنے نہ ہوتے۔ سو اُس نے دیکھنا شروع کیا — پیشوں کو نہیں، لوگوں کو۔ دو پیسٹری شیف، وہی اجزا، وہی اوزار، وہی ترکیب، پھر بھی ایک کا کیک زندہ ذائقہ دیتا، دوسرے کا محض درست۔ فرق نظر نہ آنے والا تھا، ناقابلِ پیمائش،

ناقابلِ تعلیم۔ وہ محبت کا وہ ایک اضافی گرام تھا جسے کوئی ترازو نہیں پکڑ سکتا تھا۔ یہی وہ لمحہ تھا جب وہ سمجھا: کام وہ نہیں جو تم کرتے ہو، بلکہ یہ ہے کہ تم اپنا کتنا حصہ اُس میں داخل ہونے دیتے ہو۔ اور اچانک اصل سوال — ”تم کون سا کام مفت کرو گے؟“ — کاغذ کی دیوار کی طرح ڈھ گیا۔ کیونکہ جواب کوئی پیشہ نہیں تھا۔ وہ ایک احساس تھا۔ تم مفت کام تب کرتے ہو جب کام تمہیں وہ کچھ دیتا ہے جو پیسہ نہیں دے سکتا۔ جب عمل خود غذا بن جاتا ہے۔ جب اشارہ آئینہ بن جاتا ہے۔ جب کرنا ہونے کی ایک صورت بن جاتا ہے۔ اُسے احساس ہوا کہ ہر کام مفت کیا جا سکتا ہے — اس لیے نہیں کہ دنیا کو بلا معاوضہ ہونا چاہیے، بلکہ اس لیے کہ لذت ہی واحد اصلی کرنسی ہے، واحد جس میں افراط زر نہیں ہوتا، جو بگڑتی نہیں، جس کی میعاد ختم نہیں ہوتی۔ اُس نے یہ سب سکھانے کے لیے نہیں لکھا، بلکہ اُن کے لیے ایک نشان چھوڑنے کو جو اُس کے بعد آئیں گے: نوجوان، تذبذب میں پڑے ہوئے، وہ جو ابھی اپنے مستقبل سے سودے بازی کر رہے ہیں۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ جان لیں کہ اصل ارتقا اوپر کی طرف نہیں، اندر کی طرف ہے۔ کہ اصل منتقلی ایک نوکری سے دوسری نوکری کی طرف نہیں، بلکہ نقالی سے اصلیت کی طرف ہے۔ کہ اصل پیشہ وہ ہے جس میں محبت کوئی فالتو آرائش نہیں، بلکہ انجن ہے۔ اور یوں اُس نے ایک خاموش یقین کے ساتھ اپنی نوٹ بک بند کر دی: کام جسم ہے، محبت سانس۔ صرف مل کر ہی یہ زندگی بنتے ہیں۔

نینڈو

ہفتے کا دن

میری زندگی کبھی با ترتیب نہیں رہی۔ وہ ہمیشہ منصوبہ بند رہی ہے — گھنی، بامقصد، دور تک پھیلے ہوئے نقشے کی طرح بنی ہوئی۔ یہ مجھے اپنے پہلے پیشہ ورانہ اساتذہ سے ورثے میں ملی، ایسے آدمی جنہوں نے صرف میرے کام کو نہیں بلکہ میرے دنوں کے نجی ڈھانچے کو بھی شکل دی۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ ترتیب اور منصوبہ بندی ایک ہی چیز ہیں۔ ایسا نہیں۔ ترتیب لمحے میں جیتی ہے — صاف میز، طے شدہ نظام الاوقات، ایک عارضی ہم آہنگی۔ منصوبہ بندی مہینوں، برسوں اور زندگی کے پورے موسموں پر پھیلی ہوتی ہے۔ وہ ظاہری صورت ہے، نظم و ضبط ہے، اور یہ ٹھیک ٹھیک جاننے کا خاموش جنون کہ تم کوئی کام کیوں کر رہے ہو۔ ہر

جگہ کے مردوں کا پانی سے ایک پیچیدہ رشتہ ہے — خاص طور پر جب بات صفائی ستھرائی کی ہو۔ جب موقع ملے ہم کابل ہو جاتے ہیں۔ ہماری بیویاں ہمیں یہ کبھی بھولنے نہیں دیتیں۔ اُس ہفتے کے دن کی صبح، پچھلے پانچ برس سے ہر ہفتے کے دن کی طرح، میں کاریتاس کے مرکز گیا تاکہ اُن لوگوں کو دوپہر کا کھانا پیش کروں جن میں دوبارہ اٹھ کھڑے ہونے کی نہ طاقت تھی نہ قسمت۔ اُس دن میری ذمہ داری پہلا کورس تھا — ایک نازک کردار۔ ہمیں بے عیب ہونا تھا: ظاہری صورت، ترتیب، صفائی۔ ایک دھبا، اور پورا نظام ڈھے جاتا۔ میں مسکراہٹیں بانٹنے، کوئی لطیفہ چھوڑنے، ماحول کو روشن کرنے کا عادی تھا۔ کسی کو پاستا زیادہ نرم چاہیے تھا، کسی کو al dente، کسی کو ٹماٹر کے بغیر، کسی کو صرف پنیر کے ساتھ۔ سب کو خوش کرنا ناممکن ہے۔ سو میں اُنہیں اتوار والے بندے کے پاس بھیج دیتا — سفارت کاری کا ایک شاہکار۔ پھر ایک جوڑا آیا۔ میاں بیوی۔ اُنہوں نے مجھے دیکھا اور پوچھا کہ کیا میں فریگا ہوں۔ ظاہر ہے میں نے اُنہیں پہچان لیا۔ میرے فلسفے کے پروفیسر۔ میں نے اُن سے بیٹھنے کو کہا، اور وعدہ کیا کہ جتنی جلدی ہو سکا اُن کے پاس آ بیٹھوں گا۔ جب آخر کار میں بیٹھا تو اُنہوں نے بتایا کہ وہ ریٹائر ہو چکے ہیں، اور اپنی بیوی کی مہلک رسولیوں کے علاج پر سب کچھ خرچ کر چکے ہیں۔ اُنہوں نے گھر بیچ دیا تھا، قرض لیے تھے، اور اب اُن کے پاس کچھ نہیں تھا — کھانے بھر کو بھی نہیں۔ ایک تھکی ہوئی مسکراہٹ کے ساتھ اُنہوں نے پوچھا کہ میں کاریتاس میں کیا کر رہا ہوں۔ میں نے فوراً جواب نہیں دیا۔ دکھ میں پڑے لوگوں کو اضافی بوجھ کی ضرورت نہیں ہوتی۔ کم تفصیل، کم دباؤ۔ مگر اُنہوں نے اصرار کیا۔ سو میں نے کہا: ”یہ اہم نہیں کہ میں کیا کرتا ہوں۔ اہم یہ ہے کہ کس کے لیے کرتا ہوں، اور کب۔“ ”تم ہمیشہ اچھے طالب علم تھے، فریگا،“ اُنہوں نے کہا۔ ”بیس برسوں میں میرے بہترین شاگردوں میں سے ایک۔ میں نے تمہیں ہر جگہ ڈھونڈا۔“ جانے سے پہلے اُنہوں نے پوچھا کہ کیا ہم اگلے ہفتے کے دن پھر مل سکتے ہیں۔ میں مان گیا۔ سات دن بعد وہ وہاں انتظار کر رہے تھے۔ میں نے اُنہیں ایک فلیٹ کی چابیاں تھمائیں — کرایہ ادا شدہ — اور کہا کہ جو پیسہ بچے اُسے بلوں اور کھانے پر لگائیں۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑے۔ میں بھی رو پڑا۔ میں نے دکھ کو خوشی سے الگ کر دیا تھا، اور اس بار دونوں فریق جیت گئے تھے۔ میں نے اُنہیں مزید سوال پوچھنے کا وقت نہیں دیا۔ مگر وقتاً فوقتاً میں اُن کی خبر لیتا رہتا ہوں۔ جیسے وہ میرے والد ہوں۔ اُس ہفتے کے دن نے مجھے ایک سادہ سی بات سکھائی: زندگی کی منصوبہ بندی ذاتی اہداف حاصل کرنے کا نام

نہیں۔ یہ اس کا نام ہے کہ کسی دوسرے کی تقدیر کو ایک انچ سرکانے کے طریقے ڈھونڈے جائیں۔ اور کبھی کبھی وہی ایک انچ سب کچھ ہوتا ہے۔

نینڈو

اختتام — Brand Narrative Gillette

کسی برانڈ کا بیانیہ اشتہاری مہمات سے نہیں بنتا۔ وہ اُن زندگیوں سے بنتا ہے جو اُس میں سے گزریں۔ دوسری جلد ایک مرحلہ بند کرتی ہے: وہ مرحلہ جس میں Gillette ایک یاد تھی، ایک نوکری، ایک گزری ہوئی زندگی۔ یہاں سے آگے Gillette ایک زبان بن جاتی ہے — ایک کوڈ، ایک عدسہ، ایک ساختی منطق۔ تیسری جلد سہ جلدی سلسلے کو ”مکمل“ نہیں کرے گی۔ وہ برانڈ کو مکمل کرے گی۔ کیونکہ برانڈ وہ نہیں جو وہ بیچتا ہے۔ وہ ہے جو وہ بیچنا بند کرنے پر کہتا ہے۔ اور یہ سہ جلدی سلسلہ اُن کی تاریخ میں پہلی بار ہے کہ کوئی Gillette کو کمپنی کے اندر سے نہیں، بیانیے کے اندر سے بیان کرتا ہے۔ دوسری جلد یہیں ختم ہوتی ہے۔ بیانیہ نہیں۔

نینڈو

فرڈیننڈو فریگا